چٹان

افسانے

اوپندر ناتھ اشک

نیا ادارہ

چٹان

افسانے

اوپندر ناتھ اشک

چٹان

نیا ادارہ

۱۵۔ سرکلر روڈ۔ لاہور

ناشر: نذیر احمد چودھری

نیا ادارہ، ۱۵ سرکلر روڈ، لاہور

مطبع: اشرف پریس لاہور

پرنٹر: شیخ محمد اشرف

افسانے

کوشلیا کے نام

جو میری رفیق ہے

چٹان

شام کا سورج غروب ہونے سے قبل ہی گھرے مٹیالے بادل کے دامن میں چھپ گیا تھا۔ تاریکی وقت سے کہیں پہلے چاروں طرف چھا گئی تھی اور گگرہٹ کے پہاڑی پڑاؤ میں دھواں دیتے ہوئے ایک دو ٹین کے چراغ بھی روشن ہو گئے جب شنکر میلوں کی مسافت طے کر کے تھکا ماندہ وہاں پہنچا۔

سب سے پہلے اس نے مختصر سے بازار کے ایک گھٹیا سے تنور پر جا کر کسی نہ کسی طرح پیٹ کی آگ بجھائی، پھر وہ پناہ کی تلاش میں چل پڑا۔

یاتریوں کی اتنی بہتات تھی کہ دونوں سراؤں میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی، بے شمار لوگ باہر ویرانے ہی میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ اینٹیں رکھ کر چولہے جلائے گئے تھے۔ ٹھنڈی تیکھی ہوا چلنے لگی تھی، شعلے کانپ رہے

تھے اور نیچے وادی میں چیل کے درخت سر بسر اُٹھے تھے۔

شنکر نے بے بسی کی ایک نگاہ چاروں طرف ڈالی۔ اسے اپنے کپڑوں کی کم مائگی کا بھی خیال آیا۔ اور بے دلی سے وہ گھومتا ہوا بازار سے نیچے وادی میں اُتر گیا۔

وہیں ایک جھونپڑے میں اسے رات بھر کے لیے پناہ کی جگہ مل گئی۔ کوئی ماسٹر جی تھے اُنہوں نے وہاں بچوں کے لیے ایک سکول اور غریب پہاڑی لوگوں کے لیے ایک چھوٹا سا دواخانہ کھول رکھا تھا۔ اُنہوں نے اُسے نیچے بچھانے کے لیے ایک چٹائی دے دی اور اُوپر اُوڑھنے کو کمبل ... اور شنکر آرام سے لیٹ گیا۔

لیٹ تو گیا، لیکن اُسے نیند نہیں آئی۔ وہ بہت تھک گیا تھا یا کہ اناٹھیک طرح نہ کھا سکا تھا یا پھر نئی جگہ تھی، کچھ بھی ہو وہ سو نہ سکا۔ اُٹھ کر کمبل کو گھٹنوں تک کھینچ کر وہ کھڑکی میں بیٹھ گیا اور وہاں بیٹھے بیٹھے اُس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کے تمام واقعات ایک ایک کر کے پھر گئے۔

اُنہی دنوں جب وہ طالب علم تھا، فاقے کاٹ کر، ٹیوشن پڑھا کر اور بوقتِ ضرورت امیر دوستوں کے آگے ہاتھ پھیلا کر تعلیم کی کٹھن منزلیں طے کر رہا تھا اُس کے دل میں غیر شعوری طور پر بیراگ کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ عورت اور دولت دونوں ہی سے اُس کا دل متنفر ہو گیا تھا۔ یہ نفرت ان مصیبتوں کی وجہ

سے پیدا ہوئی تھی جو اسے حصول تعلیم کے لیے اٹھانی پڑی تھیں۔ اُس جماعتی تفاوت کو دیکھ کر پیدا ہوئی تھی جو اسے اپنے اور دوسرے طلباء کے درمیان نظر آیا یا انگوروں کی دوری نے انہیں کھٹا بنا دیا، اس سلسلے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ جب اس نے شاستری کا امتحان پاس کرنے کے بعد بی۔اے کی ڈگری لی تو جسم سے نہ سہی دل سے وہ بیراگی بن چکا تھا۔

بی۔اے پاس کرنے کے بعد کچھ اور کرنے کی اہلیت نہ رکھنے کی وجہ سے وہ بھی دوسرے ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی طرح روزگار کی تلاش میں منہمک ہو گیا۔ اُن ہی دنوں مایاوتی المورڑہ سے چھپی ہوئی سوامی رام کرشن پرم ہنس کے اُپدیشوں کی ایک کتاب اس کے ہاتھ لگی اور عورت اور دولت — پہلی کے حسن و سحر اور دوسری کے جاہ و جلال کی طرف سے اس کا دل اور بھی متنفر ہو گیا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس کے دل میں یہ خیال کبھی کبھی سر اُٹھایا کرتا تھا کہ اپنی تمام بکھری ہوئی قوتوں کو مجتمع کر کے حوصلہ اور ہمت کے ساتھ ایم۔اے ایم۔او۔ایل کی ڈگری حاصل کر کے کسی اچھے کالج میں پروفیسر بن جائے اور اس طرح اپنے ان تمام ساتھیوں کی نظروں میں اونچا اٹھ جائے جو اسے ہیچ سمجھتے تھے۔ لیکن اس نے پڑھا کہ دولت تو کوئی ایسی چیز نہیں جس کے حصول کو زندگی کا مقصد بنایا جائے — جسے حاصل کر کے اس پر فخر کیا جائے.....

جب شام ہوتی ہے جگنو چمکنے لگتے ہیں تو وہ مسرت اور غرور سے ہوا کے سینے پر تیرتے ہوئے کہتے ہیں: دنیا کو روشن کرنے والے ہم ہی تو ہیں۔ لیکن جب آسمان میں ستارے جگمگاتے ہیں تو انہیں اپنی کم ظرفی کا احساس ہوتا ہے، پھر ستاروں

کے دل میں یہی غلط فہمی جاگزین ہو جاتی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے تاریک راستے ہمارے ہی دم سے روشن ہیں۔ "چاند" ان کی اس بے وقوفی پر ہنستا ہے، اور ساری دنیا کو نور سے نہلا دیتا ہے۔ دنیا کو میں ہی ضیا بخشتا ہوں، وہ سوچتا ہے --- لیکن اُدھر شفق پھول کر سورج کی آمد آمد کی خبر دیتی ہے، اور اُدھر چاند کی ضو ماند ہو جاتی ہے۔ امارت کا بھی تو یہی حال ہے۔ ہم اپنے جاہ و جلال پر غرور کرتے ہیں لیکن اکثر کے مقابلہ میں ہم محض گداگر معلوم ہوتے ہیں اور پھر دولت سے سب کچھ مل سکتا ہے، سکون تو میسر نہیں آسکتا۔

اور عورت ---- وہ سوچا کرتا تھا: پروفیسر بن کر کسی حسین اور تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرے گا۔ اور کالج کی ان تتلیوں کو، جو اس کی طرف نگاہ غلط انداز سے دیکھنا بھی گوارا نہ کرتی تھیں، دکھا دے گا کہ وہ ان سے کہیں زیادہ حسین ساتھی کی رفاقت کے قابل ہے (شادی کے لیے ہندوستان میں اب تک بھی روپے اور رتبے کی ضرورت ہے۔ ان کے مقابلے میں علم، دماغ اور حسن اب بھی بازی ہار جاتے ہیں۔ اس نے بارہا اپنے سے کہیں زیادہ کالے کلوٹے لیکن متمول نوجوانوں کو حسین ترین بیویاں بغل میں لیے گھومتے دیکھا تھا) لیکن اس نے پڑھا ---- یہ عورت ہے جو انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے۔ آزاد طائر کے پر نوچ لیتی ہے ضروریات زندگی کو بڑھا کر اسے جھکنا سکھا دیتی ہے۔ اور اس نے سوچا، وہ نہیں جھکے گا، وہ آزاد رہے گا، آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرے گا اور خوش آئند نغمے الاپے گا۔

اس نے منہ پر بھی کمبل لے لیا اور لیٹ گیا۔ اوپر بازار میں گاڑیوں کی چوں چرچوں شروع ہو گئی تھی۔ منچلے جاتری، جو صبح منزل ہی پر پہنچ کر آرام کرنا چاہتے،

تھے راستے کی راحت کا موہ چھوڑ کر چل دیے تھے۔ اس نے ایک سرد آہ بھری۔ اس کی منزلِ کہاں ہے؟ اس نے سوچا۔ وہ تو کہیں بھی نہ پہنچ سکا۔ نہ یونیورسٹی کی سب سے بڑی ڈگری لے سکا اور نہ آسمان کی بلندیوں میں اڑ کر خوش آئند نغمے ہی الاپ سکا۔

اس نے بیراگی بن جانے کی بجائے دوآبہ کے ایک نئے کھلے سناتن دھرم ہائی اسکول میں ملازمت کر لی۔ نئے اور پھر سناتن دھرم میں، اس لیے کہ وہ ٹرینڈ نہ تھا اور سرکاری یا پرانے جمے ہوئے سکولوں میں اسے ملازمت نہ مل سکتی تھی۔

لیکن سناتن دھرمی درس گاہوں کے پاس وہ پیسے کو جوڑ جوڑ کر رکھنا اور دوراندیشی سے خرچ کرنا کہاں۔ سال ہی میں وہ سکول بند ہو گیا۔ بات یہ ہوئی کہ دوآبہ کے ایک مشہور سیٹھ صاحب کو کوئلے میں کئی لاکھ کا فائدہ ہوا تھا۔ انہوں نے ایک لاکھ روپیہ کے دان سے سکول کی بلڈنگ بنوا دی اور ایک بڑی رقم ماہوار دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن دوسرے سال ان کو سٹے میں خسارہ رہا۔ اور سکول کے پاس وہ بلڈنگ ہی رہ گئی جسے دیکھ کر سادھو سنتوں اور کنفا واچکوں نے سناتن دھرم کی شان دوبالا کرنے کے لیے وہاں ڈیرے جما دیے۔

شنکر آزاد ہو گیا لیکن وہ آسمان کی بلندیوں میں پھر بھی اڑ نہ سکا۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کو بھی اس کا دل نہ چاہتا تھا اور دنیا کی تمام خواہشات کو ترک کرنے کے لیے جس مشق و مشورے کی ضرورت ہے، وہ اسے میسر نہ تھا۔ آخر اس نے سوچا کہ وہ اپنے دیس چلا جائے گا۔ وہاں کسی گورو کی تلاش کرے گا۔ جو اسے صحیح راستے پر لگا دے لیکن اپنے وطن کو جانے سے پیشتر وہ کوہ شوالک کی پہاڑیوں میں چنت پورنی کے اس میلے کو دیکھنے کا لالچ نہ چھوڑ سکا تھا۔ دوآبہ کے باشندوں

میں اس میلے کے سلسلے میں اتنا جوش وخروش تھا کہ وہ بھی ان میں سے اکثر کی طرح ہوشیار پور سے پیدل چنت پورنی تک گیا تھا۔ وہاں سے پیدل ہی واپس آیا تھا۔ اس کے پاؤں میں درد تھا ٹانگیں تھک گئی تھیں اور اس کے دل میں اضطراب کی ایک نامعلوم سی آگ سلگ رہی تھی۔

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کھڑکی کے ساتھ سر ٹکا دیا اور چپ چاپ باہر کی طرف دیکھنے لگا۔

آسمان پر تیتر کے پروں جیسے بادل چھائے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے سے چاند اپنی مدھم سی روشنی کو پھیلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا لیکن اس روشنی سے مسافروں کو کچھ زیادہ فائدہ نہ پہنچتا تھا۔ سامنے دور سڑک پر شنکر لالٹینوں کی ٹمٹماتی روشنیوں کو دھیمی رفتار سے چلتے دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کچھ پیدل چلنے والوں کے ہاتھوں میں تھیں اور کچھ بیل گاڑیوں کے نیچے لٹک رہی تھیں۔ جب ایک روشنی کے بعد ایک لمبی قطار میں یکے بعد دیگرے روشنیاں نظر آتیں تو وہ سمجھ جاتا کہ گاڑیوں کے آگے ایک شخص ہاتھ میں لیمپ لیے چلا جا رہا ہے ــــ اور پھر یہ روشنیاں اسی طرح یکے بعد دیگرے تاریکی میں گم ہو جاتیں اور بیل گاڑیوں کی آواز کسی دور اُفتادہ ملک سے آنے والی آوازوں کی طرح معلوم ہونے لگتیں ... پھر نئی گاڑیاں آتیں اور نئی روشنیاں ... لیکن نیچے وادی اسی طرح تاریک تھی اور چاند اُوپر اسی طرح لہروں سی بدلیوں میں مسکرا رہا تھا۔

شنکر نے ایک لمبی سانس لی۔ پاؤں کی آہٹ پا کر وہ چونکا۔ شاید دوسرے مہمانوں کا انتظام کر کے ماسٹر جی اُدھر ہی سے گزر رہے تھے۔

"نیند نہیں آرہی ہے کیا؟" کھڑکی کی مدھم روشنی میں اس کے سلہوٹ دیکھ کر انہوں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

ماسٹر جی کی آواز میں کچھ ایسی بات تھی جو دوسروں میں بے ساختہ ایک احترام کے جذبے کو جگا دیتی تھی۔

"جی نہیں" کھڑکی سے نگاہیں ہٹا کر اور کچھ گھبرا کر مڑتے ہوئے اس نے کہا۔ "مجھے ذرا دیر ہی میں نیند آتی ہے۔"

اور ماسٹر جی خود بھی اس کے پاس ہی چٹائی پر بیٹھ گئے۔

ماسٹر جی کی باتوں میں کچھ ایسا جادو تھا، ان کے حسن سلوک اور ان کی آواز میں کچھ ایسی ہمدردی تھی کہ شنکر نے ایک بھولے بھالے سادہ لوح بچے کی طرح اپنے دل کی تمام خلش، اپنی زندگی کی تمام کش مکش، جدوجہد اور ناکامیوں کو ان کے سامنے رکھ دیا۔

انہوں نے اسے تسلی دی: "اپنی مصیبتوں پر تمہیں دکھی نہ ہونا چاہیئے۔ زندگی میں وہ شخص ایک بڑی دولت سے محروم رہ جاتا ہے جو کش مکش حیات میں حصہ نہیں لیتا۔ اسے جب مایوسی ہوتی ہے، اس پر جب مصیبت آتی ہے، اس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے لیکن جس شخص نے زندگی کا تلخ گھونٹ پیا ہو، مایوسیاں اور مصیبتیں اس پر کچھ اثر نہیں کرتیں۔"

شنکر چپ چاپ سنتا رہا۔

"تجربہ کا گھونٹ تلخ تو ضرور ہے" لمحہ بھر کے توقف کے بعد انہوں نے کہا

"لیکن یہ انسان کو مستقل مزاجی بخشتا ہے، اسے آندھیوں اور طوفانوں میں غیر متزلزل فیصلے کرنے کی طاقت دیتا ہے، اور وہ آنکھیں عطا کرتا ہے جو دکھ سکھ کو یکساں نظر سے دیکھتی ہیں۔"

اور شنکر نے محسوس کیا جیسے ان کی آواز ایک ٹھنڈی، راحت نا مرہم کی طرح اس کے تمام زخموں پر لگتی چلی جا رہی ہے۔

وہیں بیٹھے بیٹھے ماسٹر جی نے اسے بتایا کہ انہوں نے کس طرح خود ایک امیر گھرانے میں جنم لے کر ان تلخیوں کا مزا چکھا۔ باپ کے متمول ہونے کے باوجود انہوں نے اس سے کسی طرح کی مدد نہیں لی۔ رشتے ناطوں کے لنگر کو توڑ کر وہ اپنی زندگی کی کشتی کو خود کھیتے رہے۔ وہ سرکاری ملازم رہے، مدرس، کلرک، اکاؤنٹنٹ اور والنٹیئر بنے۔ کئی انجمنوں کے سیکریٹری رہے۔ کسانوں میں انہوں نے کام کیا۔ مہاتما گاندھی کے آشرم میں وہ رہے۔ جیل میں بھی دو بار ہو آئے اور اس کے بعد انہوں نے کسی طرح نوعِ انسان کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنی روح کی خدمت کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا۔

"میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے" انہوں نے شنکر کی پیٹھ پر تھپتھپاتے ہوئے کہا "زندگی میں اگر کوئی اونچا مقصد نہیں تو یہ زندگی کچھ بھی نہیں، ایک خالی کھوکھلی سی چیز ہے اور پھر اپنی روح کو زندگی کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے اس عظیم، لامحدود، لاشریک طاقت کے ساتھ ملا دینے سے بڑا مقصد اور کونسا ہو سکتا ہے؟ زندگی کی دلدل لحظہ بہ لحظہ روح کو اپنے اندر دھنساتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ دلدل رہ جاتی ہے، روح نہیں رہتی۔ ایک ہی بار زور لگا کر روح کو اس

دلدل سے آزاد کر لینا، آزاد فضا میں سانس لینا، آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرنا اور قدرت کے ذرے ذرے میں اپنے پرتو کو دیکھنا۔ اس سے بڑا مقصد اور اس سے بڑی آزادی اور کیا ہو سکتی ہے؟"

شنکر نے پُر شکوک لہجے میں کہا: "لیکن یہ تو سب کچھ ترک کر دینے، مایا موہ کے جال کو توڑ دینے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اگر سب تارک الدنیا ہی ہو جائیں تو۔۔۔"

"میں تارک الدنیا ہونے کے لیے نہیں کہتا" انہوں نے کہا۔ "دنیا میں رہو لیکن دنیا کے ہو کر نہ رہو۔ اس پہاڑ کی طرح، جس کے پاؤں پاتال کی گہرائیوں میں ہوتے ہیں، لیکن جس کی برفانی چوٹیاں ہمیشہ سنہری روشنی سے جگمگاتی رہتی ہیں۔"

"لیکن۔۔۔" مگر جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا اس کے اظہار کیلئے اُسے الفاظ نہ ملے۔ اس کے تذبذب کو بھانپ کر ماسٹر جی بولے: "تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ آسان نہیں، ہاں، یہ آسان نہیں۔ لیکن جو شخص ضبطِ نفس کے پارس کو چھو کر ایک بار سونا بن جاتا ہے، وہ اگر برسوں زمین میں دبا رہے تو بھی سونے کا سونا رہتا ہے۔ ضبطِ نفس کی تربیت حاصل کرنے کے بعد جو شخص اس دنیا میں داخل ہوتا ہے، دنیا کا کیچڑ اُسے لت پت نہیں کر سکتا۔ دنیاوی خواہشات اس پر کچھ اثر نہیں رکھتیں۔ وہ چٹان بن جاتا ہے اور خواہشات کی کیلیں اس میں سوراخ کرنے کی بجائے خود مڑ جاتی ہیں۔"

شنکر کو اس رات نیند نہ آئی۔ ماسٹر جی کا ایک ایک لفظ اس کے کانوں میں گونجتا رہا اور جب اس کی آنکھ لگی تو اس نے اپنے آپ کو چٹان بنتے پایا۔ چٹان جس پر مایا موہ کی بارشیں، آندھیاں اور طوفان کچھ اثر نہیں کرتے۔ اس نے دیکھا کہ وہ سُکھ دُکھ کی پرواہ نہ کر کے، گاؤں کی روکھی سوکھی روٹی پر خوش رہ کر، زمین

پر سو کر بالغوں کو تعلیم دے رہا ہے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو ادویات کا بیگ لیے گاؤں گاؤں گھومتے دیکھا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو جیل میں پڑے پایا جہاں قیدیوں کو بہتر سلوک دلوانے کے لیے اس نے بھوک ہڑتال کی۔ اُسے پیٹا گیا۔ اُسے کوڑے لگائے گئے۔ لیکن وہ خاموش، ساکن، غیر متحرک بیٹھا رہا۔ چٹان بن گیا تھا وہ۔

لیکن پھر اس نے چٹان کو بجلی کی سی سرعت سے ایک ڈھلوان پہاڑی پر لڑھکتے ہوئے نیچے سمندر کی اُبلتی ہوئی لہروں کی طرف جاتے پایا...

اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا، اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا تھا۔ باہر جیل کے درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ چاند شاید تھک کر سو گیا تھا۔

لیکن شنکر جاگتا رہا۔

یہ ڈھلوان پہاڑی بھابی تھی، اور اُبلتی ہوئی لہریں نفسانی خواہشات ــــ اس کا پتا شنکر کو بہت دیر بعد لگا۔

بھابی، بھائی صاحب کی رفیقۂ حیات تھی اور وہ ماسٹر جی ہی کو بھائی صاحب کے نام سے پکارنے لگا تھا۔

دوسری صبح اُس نے اپنے آپ کو ماسٹر جی کے قدموں پر ڈال دیا تھا اور ان کو

نے اسے تسلی دی تھی کہ خواہ اسے دھن دولت اور عیش و آرام نہ ملیں لیکن اُسے دل کا سکون ضرور میسر آ جائے گا۔ اور وہ اُن کے پاس ہی رہنے لگا تھا۔

اور پہلے پہل تو اُسے یہ سکون ملا بھی تھا، وہ جب کبھی بھائی صاحب کے پاس بیٹھتا، جب بھی اُس نے ان کی باتیں سنیں اس کے دل کو سکون میسر ہوا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے تسکین نفس کا ایک بحرِ بیکراں موجزن ہے اور وہ اس میں جی بھر کر ڈبکیاں لگا رہا ہے۔ ہاں، بعد کی بات دوسری ہے۔

لوگ بھائی صاحب کو ماسٹر جی اس لیے کہتے تھے کہ وہ اپنے خرچ پر دیہاتی بچوں کا ایک چھوٹا سا سکول چلاتے تھے۔ انھوں نے ایک دواخانہ بھی کھول رکھا تھا۔ اس لحاظ سے وہ ڈاکٹر صاحب بھی کہلوا سکتے تھے اور کچھ لوگ انہیں اس نام سے پکارتے بھی تھے لیکن اُن کا اصلی نام دیال سرن تھا اور اس نے بھابی سے ان کے متعلق بہت سی باتیں سنی تھیں۔

ماسٹر جی کے والد گورنمنٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ کافی روپے والے تھے لیکن کالج چھوڑنے کے بعد ہی ماسٹر کو پبلک سیوا کی سنک (بھابی یہی لفظ استعمال کیا کرتی تھی) سوار ہو گئی۔ میڈیکل گروپ میں اچھے بھلے پڑھ رہے تھے، فرسٹ ایر کا امتحان دیا تھا کہ کانگریس کی تحریک شروع ہوئی۔ بس تعلیم سے ان کا من اچاٹ ہو گیا۔ والد نے سمجھا بجھا کر، مل ملا کر اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازم کروا دیا اور لگے ہاتھوں (ان کے نہ نہ کرنے کے باوجود) شادی کر دی، لیکن...

”نوکری سے استعفا، معلوم ہے انھوں نے کیسے دیا؟“ ایک دن کھانا کھاتے

ہوئے بھابی کہنے لگی، ورنہ سان نہ گمان، بس سُن لیا کہ استعفاء دے آئے ہیں اور پھر استعفاء بھی صاف لکھ آئے کہ جس سرکار نے ہمیں ایک صدی سے غلام بنا رکھا ہے، اس کا پرزہ بن کو کام کرنا مجھے منظور نہیں۔ جب لالہ جی کو پتہ لگا (اپنے سسر کو بھابی لالہ جی کہہ کر پکارتی تھی) تو انہوں نے سر لپیٹ لیا۔ وہ تھے سرکاری ملازم۔ انہوں نے بہتیرا سمجھایا کہ مجھے نوکری سے جواب مل جائے گا۔ افسران مجھے شک کی نظروں سے دیکھنے لگیں گے۔ لیکن یہ تو فیصلہ کر کے بدلنے کے دن پیدا ہی نہیں ہوئے، گھر چھوڑ کر گاندھی جی کے آشرم میں چلے گئے۔"

اس کے بعد بھائی صاحب نے پبلک سیوا کے بیسیوں کام کیے۔ لالہ جی انہیں ساری عمر سمجھاتے رہے۔ اپنے بڑھاپے کا واسطہ دلاتے رہے۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنی دھن میں جنونیوں کی طرح لگے رہے۔ آزادی کے حصول کو انہوں نے اپنا نصب العین بنا لیا۔ سوشل اور سیاسی آزادی کے لیے کوشش کرتے کرتے وہ روح کی آزادی کے لیے کوشش کرنے لگے۔ اُن ہی دنوں اُن کے پتا جی فوت ہو گئے۔ اس وقت ان کے حصے میں جو روپیہ آیا اسے بنک میں جمع کرانے کے بعد بچوں کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کر کے وہ لگر یٹ آر ہے۔ یہاں انہوں نے لوگ سادھن کا چھوٹا سا آشرم کھول لیا۔ بنک کے سود سے بچوں کی تعلیم کا خرچ نکال کر جو بچتا تھا، اُس سے آشرم کا خرچ چلانے لگے۔ جس میں اُنہوں نے ایک چھوٹا سا سکول اور دواخانہ بھی کھول دیا۔

"یہ تو تجھے بھی وہیں چھوڑتے تھے۔" ایک دن بھابی نے اسے بتایا۔ "لیکن میں رہی نہیں، ساتھ آ گئی۔"

لیکن یہاں آکر بھابی خوش نہ تھی۔ شنکر نے اسے شاذ ہی ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ جب بھی کبھی وہ ہنسی، شنکر کو اس کی ہنسی میں ایک گہرے سوز اور طنز کی لکیر صاف دکھائی دی۔ پھر شنکر نے سنا تھا کہ اس کا دل بڑا کمزور ہے، ذراسی بات پر بے طرح دھڑکنے لگتا ہے، فٹ بھی آجاتے ہیں اور سر درد کی شکایت بھی عام رہتی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں کچھ ایسی تشنگی، کچھ ایسی پیاس رہتی تھی کہ شنکر کے دل میں رحم کا ہلکا سا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے . . .

لیکن وہ اس کی آنکھوں میں کم ہی دیکھتا۔ بھائی صاحب سے اس نے سیکھا تھا کہ عورت سے بچنے کے لیے ہمیشہ اس کے پاؤں کی طرف دیکھو، اسے ہمیشہ ماں کے روپ میں دیکھو، اور وہ ایسا ہی کرتا تھا۔ بھابی اسے سارے سنسار کی ماں کے روپ میں دکھائی دیتی اور دل ہی دل میں اس کے چرنوں میں جھک جایا کرتا۔ ایسا کرنے میں اُسے بے انتہا سکون اور روحانی قوت حاصل ہوتی، لیکن ایسے بھی موقعے آتے، جب اس کے ضبط اور سکون کے پاؤں ڈگمگا جاتے . . .

. . . بھابی پکار رہی تھی اور وہ نیچی نظر کیے رسوئی میں کھانا کھا رہا تھا۔ بات چل پڑی روکھی سوکھی روٹیوں اور پراٹھوں کے متعلق۔ بھابی نے اسے بتایا کہ بھائی صاحب کے ساتھ ہمیشہ اَن چپڑی روٹیاں کھانے کی وجہ سے اب تو اسے ہضم ہی نہیں ہوتے، لیکن پراٹھے کھانے کی وہ بڑی شوقین تھی۔ وہ روکھی سوکھی روٹی کھا ہی نہ سکتی تھی، وہ اپنے پتا کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس کے والد ایگزیکٹو انجینئر تھے۔ اور پھر آنکھیں بھر کر اس نے شنکر کو بتایا کہ کس طرح اس کے والد کی موت

کے بعد چچا نے، جو انہی کے خرچ پر ولایت پڑھ کر آئے تھے، ان کی جائیداد سنبھال لی اور کس طرح دادی نے بھی چچا کی حمایت کی، اور کس طرح اس کی ماں کو تنگ کیا گیا اور کس طرح اسے پہلی دفعہ فِٹ آیا!

شنکر نے آنکھ اٹھا کر دیکھا، بھابی دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اس کے دل میں رحم کا ایک ہلکا سا جذبہ پیدا ہو گیا۔ لیکن اس کے دوپٹہ ہٹانے سے پہلے اُس نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں!

... پھر ایک دن بھابی نے اُسے بتایا کہ وہ یوں گم سم رہنے والی بھی نہ تھی۔ کھیلنے کودنے، ہنسنے ہنسانے والی لڑکی تھی۔ وہ اس زور سے قہقہہ لگایا کرتی تھی کہ اس کی ماں کو بارہا اسے جھڑکنا پڑتا تھا: "اس طرح ہن ہن ہنسے گی تو سسرال والے تجھے گھر سے نکال دیں گے ——"

اسے کیا معلوم تھا کہ سسرال جا کر اس کے قہقہوں کا چشمہ ہی سوکھ جائے گا اور ایک غمگین مسکراہٹ سے بھابی کے ہونٹ پھیل گئے تھے۔

شنکر آنکھیں اُٹھائے بغیر نہ رہ سکا لیکن بھابی اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس لیے اس نے اپنی نگاہیں پہلے کی طرح اس کے پاؤں میں جما دیں!

بھائی صاحب کی سرگرمیوں، ان کی اس قربانی، ایثار، زندگی کے اُس گہرے فلسفے سے بھابی کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ — "وہ لوگوں کی بلا اپنے سر لے لیتے ہیں" اس نے ایک دن شنکر سے کہا اور پوچھا کہ خواہ مخواہ مصیبت مول لینا اچھی بات ہے کیا؟ اور پھر بتایا کہ کس طرح جب وہ ہوشیار پور کے ایک نیشنل اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور وہاں کی کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری تھے انھوں نے ایک لڑکی کی

مدد کی تھی، اور خواہ مخواہ بدنامی مول لی تھی۔

"اس لڑکی کے ماں باپ مر گئے تھے، بھائی آوارہ تھے اور ماموں اسے ایک بوڑھے کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے پڑوس ہی میں وہ رہتی تھی ایک دن گھر سے بھاگ کر وہ ان کی پناہ میں آگئی۔ انہوں نے اس کی شادی نہ ہونے دی۔ اسے تعلیم دے کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا۔ لیکن لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ ان کے چال چلن پر شک کرنے لگے۔" زہر خند سے بھابی کے ہونٹ پھیل گئے ——— "اتنی دیر ہو گئی، منی کے جنم کے بعد جو مجھے ہی بہن کی طرح سمجھتے ہیں، اُن پر وہ لڑکی ہی کیا جادو کر دیتی؟"

اور منی ان کی دوسری لڑکی تھی اور آٹھ برس کی تھی۔

شنکر نے دبی ہوئی نگاہ سے بھابی کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اُس کی قمیص میں بٹن ٹانک رہی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر بے اطمینانی کا ایک ہلکا سا سایہ تھا، آنکھیں تھکی تھکی تھیں اور دوپہر کی تمازت سے کمھلائے ہوئے پتوں کی طرح اس کے ہونٹ خشک اور مرجھائے ہوئے تھے۔ شنکر کے دل میں رحم کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا اور اس کا دل دھک کر اُٹھا۔

دوسرے دن بھائی صاحب نے اسے بتایا کہ ان لوگوں کے لیے جو روح کی مکمل آزادی چاہتے ہیں دولت اور عورت کی خواہش کو یکسر ترک کر دینا ناگزیر ہے لیکن دنیا داروں کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ دولت اور عورت کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنی لَو پرماتما سے لگائے رکھیں، اُس شادی شدہ شخص کے لیے جو اپنی روح کو آزاد دیکھنا چاہتا ہے یہ ضروری ہے کہ جب دو ایک بچے پیدا ہو جائیں تو

اپنی بیوی کے ساتھ بھائی کی طرح رہے...

شنکر کچھ کہنے لگا تھا لیکن کہہ نہ سکا۔

بھائی صاحب بولے: "میں جانتا ہوں جو تم پوچھنا چاہتے ہو۔ ایسا کرنا مشکل ہے۔ ہاں یہ مشکل ہے لیکن میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے اپنے جذبات پر پورا پورا قابو حاصل کر لیا ہے لیکن میں نے ان ہدایات پر لفظ بہ لفظ عمل کرنے کی کوشش کی ہے اور مجھے کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ اس ضبط کو حاصل کرنے کے لیے مشق کی ضرورت ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ ہفتہ میں دو ایک دن ضرور دولت اور عورت کی دنیا سے دور رہ کر تنہائی میں بسر کرے۔ روحانی قوت حاصل کرے اور خدا سے دعا کرے کہ وہ شوہر اور بیوی دونوں کو روحانی زندگی بسر کرنے کی طاقت بخشے۔"

اور بھائی صاحب اب بھی دو تین دن تنہائی میں گزارتے تھے۔

بھابی کو لازماً ان دنوں میں کوئی نہ کوئی تکلیف ہو جاتی۔ دل دھڑکنے لگتا یا سر درد ہو جاتا تھا۔ شنکر کو ایک دو بار اس کا سر دبانا پڑا تھا، کنپٹیوں پر تیل لگانا پڑا تھا، اور ایک دن کنپٹی سہلاتے سہلاتے اس کا ہاتھ بھابی کے نرم نرم گال تک چلا گیا تھا ـــــ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا اور وہ اسی وقت سر دبانا چھوڑ کر اُٹھ آیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو لعنت ملامت بھی کی تھی اور فیصلہ کیا تھا کہ وہ اب کبھی بھابی کا سر نہ دبائے گا۔

لیکن ایک دن بھابی کو پھر فٹ آگیا اور بھائی صاحب حسبِ دستور نیچے وادی کے خوب صورت پُر سکون گوشے میں سارا دن گزارنے گئے ہوئے تھے۔

بھابی کو فِٹ پہلے بھی آتے، ماں کے دکھ کی باتیں کرتے کرتے چچا کی بیوفائی کا ذکر چل پڑنے پر، یا پھر منوہر — اپنے شوہر کے مرحوم تایازاد بھائی کی یاد آجانے پر! اس کی ہنسی، اس کا مذاق، اس کی باتیں، بھابی کی فرمائشوں کو پورا کرنے کے لیے اس کے اشتیاق، اس کی ہر ادا کا ذکر کرتے ہوئے بھابی رو پڑتی، اور اُسے فٹ آجاتا تھا۔

لیکن ان دردوں، دردِ سر یا دل کی بیماری کے ان حملوں میں بھائی صاحب بدستور متانت اور سنجیدگی سے اپنے کام میں لگے رہتے اور کبھی جب ان کی موجودگی میں کوئی ایسی ویسی بات ہو جانے پر بھابی کی بیماری عود کر آتی تو وہ کبھی نہ گھبراتے جیسے یہ بھی ان کی ریاضت کا ایک حصہ تھا۔ ہاں رات کا پڑھنا اور صبح کا چرخہ کاتنا وہ چھوڑ دیتے اور بھابی کے سرہانے آبیٹھتے۔ اس ٹھنڈی، بے حس تیمارداری سے بھابی کو سچ مچ کوئی فائدہ پہنچتا ہو، یہ تو شنکر نہ جان سکا لیکن بھابی جلد ہی بستر چھوڑ دیتی اور بھائی صاحب خود کھانا بنانے کی زحمت سے بچ جاتے۔

لیکن اس بار جب بھابی کو فٹ آیا تو شنکر حیران رہ گیا۔ شام ہو گئی تھی، اور بھائی صاحب نہ آئے تھے۔ شاید اِدھر اُدھر کسی مریض کو دیکھنے چلے گئے تھے۔ وہ اندر کمرے میں دیا سلائی لینے گیا تھا کہ اُس نے تاریکی میں سسکیوں کی آواز سنی۔

پہلے تو کمرے میں اندھیرا دیکھ کر اُس نے سمجھا کہ بھابی اندر نہیں ہے اور وہ طاق سے دیا سلائی کی ڈبیا اُٹھالے گا۔ لیکن اسی وقت اس نے سنا جیسے بستر پہ لیٹیا

ہوا کوئی سسک رہا ہے۔

"بھابی!"

سسکیاں اور بھی تیز ہوگئیں۔

"بھابی... بھابی؟"

"ہائے میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے!" اور وہ زور زور سے چیخنے لگی۔

"بھابی!"... اور وہ بستر کے قریب چلا گیا۔

"ہائے میرا دل ڈوب رہا ہے ـــــ!" اور بھابی تڑپ رہی تھی۔

شنکر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، اس نے جلدی سے لیمپ جلانے کی کوشش کی لیکن تین دیا سلائیاں جلانے کے بعد کہیں جاکر وہ لیمپ روشن کر سکا۔

لیمپ جلاکر وہ بھابی کے پاس آیا۔ وہ اسی طرح دل پر ہاتھ رکھے زور زور سے چیخ رہی تھی۔ ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر سر مار رہی تھی۔

ایسا سخت دورہ شنکر کی موجودگی میں بھابی کو پہلے کبھی نہ پڑا تھا۔ ایک دفعہ پیشتر بھی جب اسے دل کی تکلیف ہوئی تھی تو بھائی صاحب نے اُسے سپرٹ ایمونیا پلائی تھی۔ وہ بھاگ کر بھائی صاحب کے کمرے سے دوائی کی شیشی اُٹھا لایا اور اس نے ایک چمچہ بھرا۔

"ہائے، یہ مجھے اچھی نہیں لگتی" بھابی چیخی اور اس نے دانت بند کر لیے۔ اور سب کی سب دوائی اس کے گال پر سے ہوتی ہوئی گردن پر بہہ گئی۔

"نہ پئیں گی تو آرام کیسے آئے گا؟" اس نے چڑ کر کہا اور پھر چمچہ بھرا۔ لیکن بھابی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور بدستور چیختی رہی۔

اس بار شنکر نے لحاف اس کے گلے تک کر دیا۔ چارپائی پر بیٹھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں اس کی چھاتی پر رکھ کر اپنا گھٹنا رکھ دیا۔ چمچہ بھر کر ایک ہاتھ سے اس کا منہ کھول کر دوائی پلا دی۔ پھر سنبھل کر نیچے اُتر آیا لیکن اتنے ہی سے اس کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔

بھابی نے لحاف پرے کر دیا۔ دوائی کی کڑواہٹ سے ایک دو بار کھانسی اور پھر ہاتھ سے سینے کو دبا کر اسی طرح چیخنے لگی۔

"ابھی آرام آجائے گا، دوائی کو اندر تو جانے دیں۔" شنکر نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ہائے میرے دل کو دباؤ۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔"

شنکر نے پھر لحاف کو اوپر کر کے، بھابی کے سینے کو ہاتھ سے دبایا ـــ دھک دھک بھابی کا دل دھڑک رہا تھا۔

"اور دباؤ" اسے جیسے تسکین مل رہی تھی۔

شنکر چارپائی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس نے دونوں ہاتھ بھابی کے دل پر رکھ دیے۔ دباتے دباتے وہ اتنا جھک گیا کہ اس کا اپنا سینہ ـــ دھک دھک کرتا ہوا سینہ بھابی کے سینہ پر بچھ سا گیا۔

بھابی کو تسکین محسوس ہونے لگی، اس کی چیخیں کم ہو گئیں۔ اب وہ صرف سسک رہی تھی...

لیکن شنکر کے اعضا تن رہے تھے اور اس کا جسم گرم ہو رہا تھا اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسی وقت بھائی صاحب آگئے۔ اس کی جگہ

انھوں نے سنبھال لی۔ اور دوائی کے اثر، یا اُن کی آمد کی وجہ سے بھابی کو بھی آرام آ گیا۔

شنکر اس رات سو نہ سکا۔ ردِ عمل طوفان کی طرح اس کے سینے میں اُٹھ رہا تھا۔ بھائی صاحب کی صورت اس کے سامنے بار بار آ رہی تھی — اس شخص نے اپنے سکھ کو تلانجلی دی ہے، جبھی روحانیت کے آسمان میں پرواز کر سکا، جبھی روح کو آزاد کر سکا۔ اور وہ خود ذرا سا ٹکڑا آگے پا کر لپک اٹھا...

اور دوسرے دن اس نے بھائی صاحب کے سامنے اپنے تمام شکوک رکھ دیئے، جنسی ضرورتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نے پوچھا کہ دوسرے کے جسم کو سامنے پا کر بھی ضبط رکھنا کس طرح ممکن ہے؟

بھائی صاحب ہنسے: ''جسم کی ضرورتیں بھی'' انھوں نے کہا دوسری ضرورتوں کی طرح ہی ہیں۔ جس طرح ہم اپنی دوسری ضرورتوں کو بس میں کر لیتے ہیں، اسی طرح ان کو بھی بس میں کیا جا سکتا ہے۔ ہم اپنی خواہشات اور ضروریات کو جتنا بڑھا لیتے ہیں اتنا ہی وہ بڑھ جاتی ہیں اور جتنا گھٹا لیتے ہیں اتنا ہی گھٹ جاتی ہیں۔ خواہشات اور ضروریات کی دنیا میں رہتے ہوئے بھی انسان ضبط اور ریاضت سے ان پر قابو پا سکتا ہے۔ اسے دراصل چٹان بن جانا چاہیئے — ایسی چٹان جو بارش اور دھوپ دونوں کو سہ سکے، ضروریات کی زیادتی یا کمی، کوئی بھی اس کے سکون کو متزلزل نہ کر سکے۔''

چٹان اور سکون، دو الفاظ شنکر کے دماغ میں گھومتے رہے اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ چٹان بن جائے گا، چٹان جیسا ہی غیر متزلزل سکون حاصل کر لے گا۔

اپنی خواہشات پر قابو پالے گا۔ ایک بار ان کے آگے ہتھیار ڈال دے کر انسان ان کی دلدل میں دھنسا۔ نہیں، وہ ان کے اوپر اڑے گا۔ آزاد اور وسیع آسمان کی بلندیوں میں۔

لیکن بھابی جو وہاں تھی، بے اطمینانی کی سلگتی ہوئی چنگاری!

ایک رات بھائی صاحب برابر کے گاؤں میں مریض کو دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ شنکر اپنے کمرے میں دیوار سے پیٹھ لگائے کھونٹی سے ٹنگی ہوئی لالٹین کے نیچے بیٹھا مطالعے میں مصروف تھا کہ بھابی وہیں آگئی اور پھر اُس کے پاس بیٹھ گئی۔ شنکر خاموشی سے کتاب پڑھتا رہا۔ بھابی بیٹھی رہی، پھر ایک انگڑائی سی لے کر وہ وہیں چٹائی پر اس کے پاس لیٹ گئی۔

شنکر نے کنکھیوں سے ایک بار اس کی طرف دیکھا۔ ساڑھی کا پلو سر سے کھسک گیا تھا، بلاؤز کا بٹن کھل گیا تھا۔ سینہ قدرے ننگا ہو گیا تھا... شنکر نے آنکھیں ہٹالیں، لیکن الفاظ اس کی آنکھوں کے آگے تیرنے لگے۔ پھر اسے صرف سیاہ لکیروں کے سوا کچھ بھی نہ دکھائی دیا۔ اور پھر اس کے سامنے کتاب بھی نہ رہی۔ وہی صرف پاس لیٹی ہوئی عورت کے سینے کی گہری سی، اندھیری سی لکیر — جو دو کوہستانوں کے درمیان کسی وادی کی طرح دور اندھیروں میں گم ہو جاتی تھی۔

شنکر نے پھر ایک بار دیکھا۔ کنکھیوں سے — وہیں دو پہاڑیوں کے درمیان اندھیری سی وادی کی طرف۔ اس کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ کتاب اس کے

ہاتھ سے گر پڑی اور اس کی نگاہیں سڈول کولہوں، پتلی کمر اور اسی وادی پر چھچھاتی ہوئیں بھابی کے چہرے پر چلی گئیں۔ بھابی بے حس و حرکت بے ہوش سی پڑی تھی۔ اس کے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے، اور اُن کی پپڑیوں میں عمودی سی لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ وہیں شنکر کی نگاہیں جم گئیں۔ اس نے چاہا کہ ان پیاسے خشک ہونٹوں کو چوم لے، اس زور سے چوم لے کہ ان لکیروں میں خون سمٹ آئے، اور وہ جھکا۔

اُسی وقت بھابی نے آنکھیں کھول دیں۔ وہی پیاسی پیاسی، اُداس تشنہ آنکھیں۔ اُنہی آنکھوں میں دیکھتا ہوا وہ اور جھکا . . .

لیکن وہ رک گیا، وہ لکیریں اس کے سامنے سرخ کیلیں بن گئیں، اور اس نے دیکھا کہ وہ کیلیں چٹان میں سوراخ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں . . . وہ رک گیا۔ رکا اور اُٹھا، بھابی کے اوپر سے گزرتا ہوا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ تیز تیز چلنے لگا اور پھر قریب قریب بھاگنے لگا، گویا وہ کسی خونیں بھیڑیے سے بچ کر بھاگ رہا ہو۔ ننگے پاؤں، ننگے سر، رات کی سائیں سائیں کو توڑتا ہوا، مٹ میلی چاندنی کو چیرتا ہوا . . .

خنکی کافی تھی ـــ اور ہوا چیل کے درختوں سے ٹکرا کر چیخ رہی تھی۔

صبح نے شنکر کو ایک سنگلاخ چٹان پر بیٹھے ہوئے پایا۔ اس کے گھٹنوں تک مٹی چڑھ گئی تھی، تلووں میں چھالے پڑ گئے تھے، ایک پاؤں پر ٹھوکر لگ جانے سے ناخن تھوڑا سا اُڑ گیا تھا۔ اور شاید تھک ہار کر وہ اسی چٹان پر بیٹھ گیا تھا

اور شاید اُونگھ بھی گیا تھا۔

شنکر نے آنکھیں کھولیں۔ دور حدِ نظر کے آخری نقطہ پر پہاڑیاں چھوٹی ہوتی ہوئی میدان سے مل گئی تھیں اور وہاں ستلج چمک رہی تھی، جو اُن پہاڑیوں کے پانی کی نذر سمندر کے حضور میں لے جاتی تھی اور پس منظر میں ہوشیار پور کے مکانوں کی دھندلی چھتیں ہرے بھرے درختوں میں نظر آ رہی تھیں۔ اُس نے دایاں ہاتھ اپنے خشک بکھرے ہوئے بالوں پر پھیرا اور ٹانگ پسار لی۔ اُس کا گھٹنا درد کرنے لگا اور انگوٹھے کی ٹیس بھی جاگ اٹھی تھی۔ ایک حیرت زدہ سی نگاہ اس نے چاروں طرف ڈالی، جیسے وہ ان پہاڑیوں کو، چیل کے درختوں سے بھری ہوئی پہاڑیوں کو نئے سرے سے دیکھ رہا ہو۔

اس نے بایاں ہاتھ پسارا۔ ایک ننھا سا پودا اس کے ہاتھ کے نیچے مسلتا رہ گیا۔ شنکر نے دیکھا، سنگلاخ چٹان کی ایک سلوٹ پر کہیں اُوپر سے کچھ مٹی اگری تھی، ہوا میں اُڑتا ہوا کوئی بیج بھی۔ بارش کی نمی سے یہ ننھا سا پودا بھی پھوٹ پڑا تھا۔ لیکن چٹان تو چٹان تھی، پتھر! اس کی جڑ والا، کو پھیلنے کے لیے کوئی جگہ نہ دے رہی تھی اور اس نازک پودے کے پتے زرد ہو کر کمہلا رہے تھے۔

شنکر اُٹھا اور حیران نگاہوں سے دونوں کو دیکھنے لگا۔ اور پھر وہیں کھڑے کھڑے اس چٹان پر اسے ایک اور چٹان کا خاکہ بنتا دکھائی دیا اور اس پودے کی جگہ روز بروز مرجھاتا، کمہلاتا ایک اور زرد رُو پودا اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔

بینگن کا پودا

اگرچہ ماہی رام نے وہ بینگن کا پودا اکھاڑ دیا ہے۔ پھر بھی جب میں ترکاری کے کھیت کی مینڈھ پر سے ہوتا ہوا اپنی کوٹھی کو جاتا ہوں تو میری آنکھوں میں بینگن کا وہ سوکھا ہوا پودا اور اس پر لٹکتا ہوا مرجھایا، سوکھا پچکا سا زرد بینگن پھر جاتا ہے۔

سردیوں کے مختصر سے دن کو گذرے دیر ہو چکی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد جب میں ایک لمبا چکر لگا کر، نیچے کھادی کی موٹی بنیان، اس پر چھوٹا گرم انڈر ویئر اس پر موٹے کھدر کی قمیص اس پر اچکن اور گلو بند اور ان سب کے اوپر اوور کوٹ پہنے، ہاتھ میں بیٹری لیے، اپنے لوہے کی ایڑی والے فلیکس کے بوٹوں کی ٹھک ٹھک میں مست، دسمبر کی تیکھی، ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لیے کانوں کو اوور کوٹ کے کالروں میں چھپاتا ہوا

اپنی کوٹھی کے برآمدے میں داخل ہوا تو وہاں ایک میلی سی چارپائی پر ایک نحیف و ناتواں۔ بوڑھے کو خستہ اور بوسیدہ، اندھیری کالی رات کی طرح کا لحاف لپیٹے دیکھ کر کچھ ٹھٹھک سا گیا۔

"کیوں بھئی کیا بات ہے۔" میں نے اوورکوٹ کی جیبوں میں پڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لا کر کہا۔

"کچھ نہیں بابوجی، میں ماہی رام کا آدمی ہوں۔"

"ماہی رام ہی کے سہی، لیکن اتنی سخت سردی میں، تم اس کھلے برآمدے میں کیوں پڑے ہو۔"

"میرے پاس کپڑا ہے بابوجی۔"

میں نے چپ چاپ اپنا کمرہ کھولا۔ ڈِٹ مارکہ بڑا مہ الالٹین کا ٹیبل لیمپ جلتا چھوڑ گیا تھا۔ اور اگرچہ اوپر کے دونوں روشن دان کھلے تھے، پھر بھی کمرہ گرم ہو گیا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی گرم، لیکن مٹی کے تیل کی تیز لپیٹ آئی۔ بارہا میرے دوستوں نے مجھے اس طرح لیمپ جلا کر چھوڑ جانے سے منع کیا ہے۔ "شہر کی گندی فضا کو چھوڑ کر اس کھلے ماحول میں رہنے کا فائدہ ہی کیا، اگر شہر کی مضر عادتوں کو نہ چھوڑا جاتے؟" وہ کہا کرتے ہیں اور بتایا کرتے ہیں کہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق کمرے کو بند کر کے اندر لیمپ جلاتے رکھنا نہایت مضر ہے۔ سانس کے راستے گندی ہوا پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتی ہے اور پھیپھڑوں پر اس کا دباؤ پڑتا ہے۔ میں بارہا یوں محسوس بھی کرتا ہوں لیکن مجبور ہو جاتا ہوں، جب بھی کبھی دروازہ کھول کر بیٹھتا ہوں اور تیز ہوا کا جھونکا اندر آتا ہے اور میرے ہاتھ منجمد ہو جاتے ہیں اور قلم چلنے سے انکار

کر دیتا ہے تو میں اُٹھ کر کواڑ بھیڑ دیتا ہوں — جیسے سگریٹ پینے والوں کو اس کی کڑوی کسیلی، سر چکرا دینے والی بُو اچھی لگتی ہے، کچھ اسی طرح یہ سب کچھ مجھے بھی اچھا معلوم ہونے لگا ہے۔

ہیٹ کو کھونٹی پر ٹانگ کر اور گلوبند کو سر اور کانوں کے ارد گرد لپیٹ کر میں کام پر آ بیٹھا بیٹھ تو گیا۔ لیکن میرا دھیان برآمدے ہی کی طرف لگا رہا۔

اس بوڑھے کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ صبح ہی دیکھا تھا، وہ بینگن کے پودے چھانٹ رہا تھا۔ اور ہنستر کہ "دیکھو ٹی کچن" سے گھر کو آتے ہوئے، میں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے؟ اس نے بتایا تھا کہ بینگن کا پودا دو بار پھل دیتا ہے، ایک بار چھانٹ دیا جائے تو اور بھی پھلتا پھولتا ہے۔ میں نے ان سوکھے پتوں سے محروم، بینگن کے پودوں پہ ایک نگاہ ڈالی تھی۔ ایک پودے پہ ایک مرجھایا ہوا، سوکھا، سکڑا، پچکا، زرد زرد بینگن لٹک رہا تھا۔ وہاں سے ہٹ کر میری نظر اس بوڑھے پر جا ٹکی تھی۔ اس کی عمر نہ جانے کتنی تھی۔ لیکن وہ بے حد عمر دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ سردی سے بچنے کے لئے اس نے کھیس اوڑھ رکھا تھا۔ پھر بھی اس کے لکڑی سے تیلے ہاتھ، بالشت سی ٹانگیں، سوکھا چمرخ چہرہ، اور آنکھوں کے حلقے صاف نظر آتے تھے۔ اس وقت ایک عجیب سا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ بینگن کا پودا جب سوکھ جاتا ہے، تب چھانٹ دینے پر پھر سے پھل لے آتا ہے، سہانجنا بھی چھانٹنے پر پہلے سے بھی زیادہ بڑھتا ہے۔ نباتات میں ایسے درختوں اور پودوں کی کمی نہیں جو چھانٹنے پر پہلے سے بھی زیادہ پھلتے پھولتے ہیں — شہتالا... دُوب... بینجی! تو انسان کو اس خدائے برتر نے ایسا کیوں نہیں بنایا۔ لیکن وہیں کھڑے کھڑے جیسے مجھ سے کسی نے کہا کہ انسان کی بیل بھی تو امر ہے۔ موت اس کی قینچی ہے۔ مرد عورتیں بچے اور

بوڑھے، اس کے پھل پھول، پتے اور شاخیں ہیں۔ جب یہ سوکھ جاتے ہیں یا گل سڑ جاتے ہیں، یہ قینچی انہیں کاٹ دیتی ہے اور ان کی جگہ نئے نئے، ہرے بھرے، زندگی کی حرکت سے خوش، اچھلتے کودتے ہنستے ناچتے گاتے، پھول اور پتے لگتے ہیں۔ اور زندگی کی امربیل پھلتی پھولتی، جھومتی جھامتی چلی جاتی ہے۔

لیکن یہ بوڑھا یہاں سردی میں کیوں آپڑا ہے؟ کیا اس کا کوئی گھر گھاٹ نہیں اور اپنی اس محویت سے ذرا چونک کر میں نے پوچھا "کیوں جی، تم ہو کون؟"

"میں جی، ماہی رام کا آدمی ہوں۔"

"ہاں ماہی رام کے آدمی تو ہو، لیکن ماہی رام کے کیا ہوتے ہو؟"

بوڑھا کچھ جواب دینے لگا تھا کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ کتنی لمحے لگاتار کھانسنے کے بعد اپنے سانس کو مشکل سے درست کرتے ہوتے اس نے بتایا کہ وہ رشتے میں ماہی رام کا کچھ نہیں لگتا وہ اس کا ہموطن ہے۔ اس کا کنبہ بہت بڑا ہے۔ پانچ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور بیوی ہے، دو لڑکیاں ہیں۔ بیاہنے کے قابل، اور وہ روزگار کے لئے ماہی رام کے ساتھ آگیا ہے۔

اس کی آواز میں کچھ ایسا سوز تھا کہ کام کرنا میرے لئے ناممکن ہو گیا۔ میں اتنے کپڑے پہننے کے باوجود، پتلون پر کمبل ڈال کر بیٹھا ہوں اور وہ غریب باہر سردی میں پڑا ہے۔ بستر کے نام پر شاید ایک میلی پھٹی دلائی اس کے پاس ہے۔ اور وہ میلا کالا لحاف بھی برسوں کا پرانا ہے۔ قریب قریب پگھل کر میں نے کہا "تو بھائی اندر لیٹ جاؤ، باہر تو بڑی سردی ہے، برآمدہ دونوں طرف سے کھلا ہے۔ باہر تم کیوں بیٹھے ہو یوں؟"

لیکن اسی وقت سیمنٹ کے فرش پہ بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی اور دوسرے

لچھمی رام ــــ وہ ٹھیکیدار گوپال داس کا چھ فٹ تین انچ لمبا آدمی دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ بڑی سی پگڑی، اس کے نیچے کالا موٹا کمبل، گھٹنوں تک دھوتی اور پاؤں میں سیر سوا سیر کا جوتا۔ ایک دن چھ مولیوں کے لئے وہ ایک میل تک ایک آدمی کے پیچھے دوڑتا گیا تھا۔ اور وہاں پکڑ کر اس نے اسے وہ وہ ٹھنیاں دی تھیں کہ پھر اس نے کبھی ادھر کا رخ نہ کیا تھا۔

"ہم نے اسے خود یہاں سلایا ہے بابو جی، نہ جانے کون سالا رات کو کھیتوں میں ڈاکہ ڈالتا ہے۔ دو تین دن دیکھتے دیکھتے ہو گئے۔ سارے کھیت میں ایسے پھول نہ ملیں گے۔ پرسوں کوئی تمام پکے ہوتے ٹماٹر اتار کر لے گیا۔ آپ جانتے ہیں ہمیں کچن کو ترکاری بھی سپلائی کرنی ہوتی ہے اور پھر دو روپے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے وہ بھی تو اسی میں سے پورا کرنا ہے اور پھر مزدوروں کی مزدوری..."

"لیکن ترکاری پر کون ڈاکہ ڈال جاتا ہے۔ یہاں تو کبھی چوری ہوتے سنی نہیں۔ میری کوٹھی سنسان جگہ میں ہے۔ پاس کوئی کوٹھی نہیں۔ لیکن میں تو دروازے کھلے چھوڑ کر گھنٹوں غائب رہتا ہوں۔"

"نہیں بابو جی، باہر کا آدمی اتنی سردی میں صرف دس گوبھی کے پھول لینے نہیں آ سکتا۔"

"لیکن اس دن مولیاں..."

"وہ اور بات تھی بابو جی۔ وہ تو کوئی راہ چلتا آدمی تھا جاتے جاتے اکھاڑ کر لے گیا۔ یہ کوئی یہیں کا ہے۔ میں سالے کو پکڑ کر ایسا سبق دوں گا، کہ عمر بھر کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتے۔" اور اس کے موٹے موٹے ہونٹ پھیل گئے اور چیچک کا مارا ہوا چہرہ تن گیا۔

"لیکن بھائی اگر چاہو تو اسے اندر سلا دو۔"

"نہیں بابوجی، سردی تو آپ امیروں کو لگتی ہے، اسے تو یونہی محض دکھانے کے لئے یہاں سلا دیا ہے، ورنہ رکھوالی تو میں کروں گا۔ ان موٹروں کے پیچھے بیٹھ کر یونہی یہ سمجھ کر کہ بوڑھا سو گیا ہے، کوئی آیا کہ میں نے دبوچا۔"

اور وہ ہنسا۔

"لیکن اس کے پاس کپڑے . . ."

"کافی کپڑے ہیں اس کے پاس بابوجی۔"

یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ بوڑھے کو پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔

میں پھر کام میں منہمک ہو گیا، لیکن مجھ سے کام ہو نہیں سکا۔ میرے سامنے ان دونوں کے مالک کی تصویر کھنچ گئی۔ ٹھیکیدار گوپال داس۔ دھن دولت اولاد اور بے فکری سے اس کے گال اس پچاس سال کی عمر میں بھی گلاب کی طرح سرخ تھے۔ اس ہڈیوں میں پیوست ہونے والی سردی میں، جب یہ بوڑھا باہر پڑا ہے۔ وہ اپنے گرم لحاف میں لیٹا دہکتی ہوئی انگیٹھی سے گرم اپنے کمرے میں، مزے سے گپیں ہانک رہا ہوگا۔ تاش یا شطرنج میں محو ہوگا . . .

اور یونہی سوچتے سوچتے میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور کچھ غنودگی سی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ کھانا زیادہ کھا گیا تھا۔ کپڑوں کا بوجھ میں نے لاد رکھا تھا اور کمرہ خوب گرم تھا۔ میں اٹھا۔ کچھ ضروری کاغذ قلم دوات لے کر سونے کے کمرے میں چھوڑ آیا۔ میں نے سوچا کہ کل ذرا سویرے اٹھ کر کام کروں گا۔ دفتر کے کمرے کو تالا لگاتے ہوئے میں نے ایک بار بوڑھے سے پوچھا کہ اگر وہ چاہے تو دفتر کو کھلا چھوڑ دوں، لیکن "نہیں نہیں بابوجی،

میرے پاس کافی کپڑے ہیں۔" اس کا جواب سن کر، قفل بند کر کے میں اپنے چھوٹے سے، گرم سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ بستر بچھا ہوا تھا۔ صرف لحاف پر میں نے کمبل اور ڈال لیا اور کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔

بستر برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ میں نے پاؤں سکیڑ لئے اور پھر انہیں آہستہ آہستہ پھیلایا دیا۔ کئی طرح کے خیالات دماغ میں گھومنے لگے۔ بے ربط، بے ترتیب لیکن لحاف کی گرمی سے آنکھیں بوجھل ہو گئیں۔ اور پھر نیند...

سوتے سوتے کبھی ماہی رام، کبھی اس بوڑھے، اور کبھی اس کے مالک ٹھیکیدار کی صورتیں میرے سامنے آنے لگیں۔

میں نے دیکھا کہ ماہی رام نے چور پکڑ لیا ہے۔ اور وہ اسے مارتا مارتا پاس کے گاؤں دیرو کے تک لے گیا ہے اور سب گاؤں والوں کو جمع کر کے اس نے اعلان کیا ہے کہ جو ہماری سبزی چرائے گا اسے ایسی ہی سزا دی جائے گی۔ اتنا کہہ کر وہ پھر چور کو زدوکوب کرنے لگتا ہے۔ چور نہایت پُردرد نگاہوں سے اس کی طرف تکتا ہے، اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ وہ ٹھیکیدار گوپال داس کے سوا کوئی نہیں — وہی گھٹا ہوا سر، وہی پھولے ہوئے گال اور وہی چوکور ناک!

میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا پاؤں سے رضائی اُتر گئی ہے۔ زیادہ کھا جانے کی وجہ سے چھاتی کچھ بھاری ہے، اور گلا سوکھا جا رہا ہے۔

سرہانے رکھے ہوئے لوٹے سے پانی پی کر اچھی طرح سے لحاف لے کر دونوں طرف سے اسے پاؤں کے نیچے کر کے پھر لیٹ گیا۔ باہر ہوا مکانوں سے ٹکریں مار رہی تھی۔ درخت حتی الامکان اس کا مقابلہ کرتے ہوئے جوش کی شدت سے چنگھاڑ

رہے تھے ـــــ شاں ـــــ شاں ـــــ اور دور بادل کی گرج اور رعد کی کڑک بھی سنائی دے رہی تھی۔ لیکن گرم ہو کر جسم ڈھیلا پڑنے لگا اور میں پھر سو گیا۔

اس بار کیا دیکھتا ہوں کہ زور کی بارش ہو رہی ہے۔ تیز ہوا چلتی ہے، پاؤ پاؤ بھر کے اولے پڑتے ہیں۔ ساری سبزی تباہ ہو جاتی ہے۔ کیاروں میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے صرف اس مرجھاتے ہو سکڑے سمٹے، پیلے زرد بینگن کا پودا رہ جاتا ہے۔ پھر وہ بینگن میرے سامنے بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے، اور میں دیکھتا ہوں کہ اس کی شکل اس بوڑھے کی سی بن گئی ہے۔ گھٹنوں کو بازوؤں میں لے کر چھاتی سے لگاتے، وہ سکڑا سمٹا۔ ننگا، اپنی لمبی چوٹی کے سہارے لٹک رہا ہے ـــــ اولے اس کے سر پہ لگتے ہیں اور وہ اسی بینگن کے پودے کے ساتھ لٹکا ہوا جھولتا ہے۔

پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ بینگن کا پودا ایک بڑا اونچا، نہ جانے جامن کا، نہ جانے آم کا درخت بن جاتا ہے۔ لوگوں کی بھیڑ نیچے کھڑی شور مچا رہی ہے ـــــ بوڑھا مر گیا، پھانسی لے کر مر گیا۔

پھر میرے کانوں میں صرف "مر گیا" "مر گیا" کی آواز آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاخ ٹوٹ رہی ہے ـــــ کڑ کڑ... کڑ کڑ...

میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ کوئی زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ سرہانے رکھی ہوئی گرم جرابیں پہن کر، سر پہ ٹوپی رکھ اور کمبل کو اچھی طرح لپیٹ کر میں اٹھا۔ دروازہ کھولا۔ دیکھا تو سیکرٹری صاحب دوسرے کئی اصحاب کے ساتھ کھڑے ہیں۔

"کیا بات ہے۔" میں نے پوچھا۔

"رات آپ کے برآمدے میں بوڑھا مر گیا۔"

میں نے دیکھا ــــ اسی میلی سی کالی چارپائی پر اپنے ارد گرد وہی میلا لحاف لپیٹے، بوڑھا جھکا ہوا پڑا ہے۔ اس کا جسم اکڑ گیا ہے اور آنکھیں پھٹی پڑتی ہیں۔ اس کا لحاف بھیگ گیا ہے۔ دُور دُور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے اور برآمدے کا سارا فرش گیلا ہے۔

"میں نے تو رات ہی اس سے کہا تھا کہ دروازہ کھلا ..." میں نے کہنا شروع کیا۔

"میں چائے کے لئے کچن سے دودھ لینے جا رہا تھا کہ اسے بارش میں بھیگتے پایا۔ آواز دی لیکن یہ ہلا تک نہیں۔ آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات سردی میں اکڑ گیا ہے۔" اور ٹھیکیدار کے آدمی سے انہوں نے کہا کہ اسے اٹھوانے کا انتظام کیا جائے۔

اس کے دو دن بعد، کچن کو جاتے ہوئے اچانک رُک کر میں نے ماہی رام سے کہا۔

"خدا کے لئے اس پیلے سے بینگن کے پودے کو اکھاڑ دو۔"

میری آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ ماہی رام حیران سا میری طرف دیکھنے لگا۔ اور پھر اس نے کہا۔

"بہت اچھا سرکار!"

اُبال

جب دودھ اُبل اُبل کر کوئلوں پہ گرنے لگا اور "شاں، شاں،" کی آواز کے ساتھ ایک تیز سی بُو اٹھی تو چندن نے ہڑبڑا کر پتیلی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کوئلوں کی تپش سے سُرخ ہو رہی تھی۔ بے بسی کے انداز میں چندن نے جلد جلد اِدھر اُدھر دیکھا —— کوئی کپڑا پاس نہ تھا۔ اس نے چاہا، پانی کا چھینٹا ہی دے دے لیکن لوٹے کے پانی میں ابھی ابھی اس نے آٹے والے ہاتھ دھوتے تھے۔ دودھ اُبل رہا تھا اور جلی ہوئی جھاگ کی بُو کمرے میں پھیلنے لگی تھی۔ اندر اس کے مالک اور مالکن آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ بے بسی کے اس لمحے میں چندن کے بڑھے ہوئے ہاتھ اور آگے بڑھ گئے اور لحظہ بھر میں تلپتی، جلتی پتیلی کھٹ سے فرش پہ آ گئی۔ چندن کی انگلیوں کی پوریں جل گیئں، اُبلتا ہوا دودھ اُس کے ہاتھوں پر گر گیا اور جلن کی وجہ سے اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ایک "سی" نکل گئی۔

پتیلی کو کھٹ سے فرش پر رکھتے ہوتے تھوڑا سا دودھ فرش پر بھی گر گیا تھا۔ باسی آٹے کے پانی سے اس نے اسے دھو ڈالا۔ اور انگلیوں کی جلن کو جیسے جھٹک کر اُتارتا ہوا وہ غسل خانے کی طرف بھاگا۔

پانی کی دھار کے نیچے ہاتھ رکھے رکھے اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور مسکرایا جب بھی کبھی اس سے کوئی بے وقوفی سرزد ہو جاتی تھی۔ وہ اسی طرح سر ہلا کر ہونٹوں کے بائیں کونے میں مسکرایا کرتا تھا۔ اور ہونٹ کٹے ہونے کے باعث اس کے دانت دکھائی دینے لگتے تھے۔

بات یوں ہوئی کہ دودھ کو انگیٹھی پر رکھ کر وہ اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سننے میں محو ہو گیا تھا۔ دن کافی چڑھ آیا تھا اور چندن نے دوپہر کے کھانے کے لئے آٹا تک گوندھ لیا تھا۔ لیکن وہ دونوں ابھی بستر ہی میں تھے اور کچھ ہی دیر پہلے اس کے مالک نے وہیں سے چندن کو چائے بنانے کا حکم دیا تھا۔

اس نے دودھ کی پتیلی کو انگیٹھی پر رکھ دیا تھا اور دروازے کی طرف کان لگائے اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سننے لگا تھا۔ جب سے اس کے مالک کی شادی ہوئی تھی۔ وہ دیر سے اٹھتا تھا۔ اس سے پہلے وہ علی الصبح اٹھنے کا عادی تھا۔ نور کے تڑکے اٹھ کر وہ چندن کو اٹھاتا۔ مالش کرواتا۔ ورزش کرتا۔ بارہا سیر کو بھی جاتا۔ لیکن اب وہ اپنی اس نئی بیوی کے ساتھ دن چڑھے تک سویا رہتا۔ جب جاگتا تو وہیں لیٹے لیٹے اسے چائے بنانے کا حکم دے کر عرصہ تک بیوی سے باتیں کرنے میں مصروف رہتا۔ اور چندن کو ان باتوں میں رس آنے لگا تھا۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہوتے، وہ بیٹھا انہیں سننے کی کوشش کیا کرتا۔

آنچ کی تیزی کے باعث دودھ پتیلی میں بے طرح ابل کھا رہا تھا۔ اور چندن اس

طرف سے بے خبر ہمہ تن گوش اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سننے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"میں مجبور ہو جاتا ہوں۔ تمہارے گال ہی ایسے ہیں ..."

"آپ کے ہاتھوں کا تو کوئی قصور نہیں۔"

"اتنے اچھے ہیں تمہارے گال کہ ..."

"جلنے لگے ہیں آپ کے چپتوں سے۔"

"لو میں انہیں ٹھنڈا کر دیتا ہوں ..."

اور چیندن کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے نرم و نازک پھول ریشم کے فرش پر جا پڑا ہو تصور ہی تصور میں اس نے دیکھا کہ اس کے مالک نے اپنے ہونٹ اپنی بیوی کے گالوں سے چپکا دیئے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم گرم ہونے لگا۔ اس کے اعضا تن گئے اور تصور ہی تصور میں اپنے مالک کی جگہ اس نے لے لی۔

ہاتھ دھو کر اس نے سر کو پھر جھٹکا دیا اور ہونٹوں کے بائیں کونے سے مسکراتا ہوا وہ اندر گودام میں گیا۔ اس نے ذرا سا سرسوں کا تیل لے کر اپنے ہاتھوں کی میلی، سیاہ، جلتی ہوئی پشت پر اس جگہ لگایا۔ جہاں جلن ہو رہی تھی۔ پھر جا کر وہ باورچی خانے میں بیٹھ گیا اور اس نے چائے کی کیتلی انگیٹھی پر رکھ دی۔

لیکن ہاتھ جلانے اور اپنی اس محویت پر دوبارہ سر ہلا کر مسکرانے کے باوجود اس کے کان پھر کمرے کی طرف جا لگے اور اس کا تصور اپنی تمام یکسوئی کے ساتھ اس کے سامعہ کی مدد پر ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے پھر کئی تصویریں بننے اور مٹنے لگیں۔

"چندن!" اس کے آقا نے چیخ کر آواز دی۔ اور پھر کہا۔ "وہیں مر گیا گیا؟"

آقا کی آواز سن کر وہ چونکا۔ جلد جلد چلتے اور ٹوس تیار کر کے اندر لے گیا۔ اس کی مالکن اور مالک حسب دستور بستر پر پڑے تھے۔ وہ دونوں ہم آغوش تو نہ تھے لیکن پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے لگے تکیے کے سہارے لیٹے ہوتے تھے۔ لحاف ان دونوں کے سینے تک تھا۔ اور مالک کا بازو ابھی تک مالکن کی گردن کے نیچے تھا۔

"ادھر رکھ دو!"

چندن نے بڑے تپائی پر رکھ دی۔

ایک نظر دیکھ کر مالک نے کہا۔ "تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ دودھ کا جگ کہاں ہے؟"

"جی ابھی لایا۔" اور سر کو ایک بار جھٹکا دے کر ہونٹوں کے بائیں کونے سے مسکراتا ہوا وہ رسوئی کی طرف بھاگا۔

دوسرے لمحے اس نے دودھ کا برتن لا کر رکھ دیا۔ لیکن اسے پھر گالیاں سننا پڑیں۔ کیونکہ دوبارہ دیکھنے پر مالک کو معلوم ہوا کہ چھلنی بھی نہیں ہے۔

چندن نے چھلنی لا کر رکھ دی اور لمحے بھر کے لئے وہیں کھڑا رہا۔ اس کی دبی ہوئی نگاہ اپنی مالکن کے چہرے پر جا پڑی — خوبصورت لمبے کھلے بالوں کی لٹیں اس کی گوری پیشانی پہ بکھری ہوئی تھیں۔ ہونٹ سوکھے ہونے کے باوجود گیلے گیلے تھے۔ مسکراتی سی آنکھوں میں خمار کی باریک سی لکیر تھی۔ اور چہرے پہ ہلکا سا اضمحلال چھایا ہوا تھا۔ اس کے مالک نے بڑے پیار سے کہا۔ "چائے بنا دو نا جان!"

لیکن جان نے روٹھتے ہوئے کروٹ بدل لی۔

"میں کہتا ہوں چائے نہ پیو گی۔" اسے مناتے ہوتے مالک نے کہا۔
"مجھے نہیں پینی چائے۔" گال کو مسلتے ہوتے مالکن نے جواب دیا۔
گردن کے نیچے کا بازو اٹھا اور مالکن اپنے مالک کی آغوش میں بھنچ گئی۔
"کیا کرتے ہو شرم نہیں آتی۔"
چندن کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اور اس کے مالک کا قہقہہ کمرے میں گونج اٹھا۔
"اٹھو نا بنا دو چائے!" مالک نے بڑی ملائمت سے ہاتھ کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کہا۔ "تمہارے گال ہی ایسے پیارے ہیں کہ خواہ مخواہ ان پر چپتیں لگانے کو جی چاہتا ہے۔"
تڑپ کر مالکن نے پھر کروٹ بدل لی۔
"چندن تم بناؤ چائے۔"
شدتِ احساس سے کانپتے ہوتے ہاتھوں سے چندن نے چائے کی پیالی بنائی۔
پیالی اٹھا کر اپنی جان کو آغوش میں بھینچے ہوتے اس کے مالک نے پیالی اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔

یہ "جان" کا لفظ تھا۔ یا اس کے مالک کا اس کے سامنے بیوی کو آغوش میں لینے کا طریقہ کہ جب دوپہر کو چندن کام کاج سے فارغ ہو کر اپنی کوٹھڑی میں جا لیٹا تو اس کے سامنے زہرہ جان کی تصویر کھینچ گئی۔ اور اس نے اضطراری طور پر سرسوں کے تیل اور مٹی میں سنے ہوتے بے غلاف کے خستہ اور بوسیدہ تکیے کو اپنی آغوش

میں بھینچ لیا۔

اچانک اُبل کر اوپر آجانے والے دودھ کی طرح نہ جانے زہرہ کی یہ تصویر کس طرح اس کے بچپن کے گہرے دبے غاروں سے نکل کر اس کے سامنے آگئی — وہی بوٹا سا قد۔ بھرا بھرا گداز جسم۔ بڑی بڑی چنچل آنکھیں۔ پان کی لالی سے رنگے ہونٹ بھرے کولہے۔ وہی سینے کا اُبھار اور وہی مسکراہٹ۔ جس کے منبع کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ کہ آیا پہلے اس کی آنکھوں میں شروع ہوتی ہے یا ہونٹوں پر۔

وہ اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ اور ماں باپ کے مرجانے کی وجہ سے اپنی موسی کے پاس رہا کرتا تھا۔ اس کی یہ موسی ایک سیٹھ کے بچوں کی دایہ تھی۔ یہ سیٹھ چاوڑی بازار میں گراموفون اور دوسرے سازوں کی دکان کرتا تھا۔ اسی دکان کے ساتھ زہرہ کا چوبارہ تھا۔ اور سیٹھ کی دکان کے باجے آہستہ آہستہ چاندی کے سکے بن بن کر وہاں پہنچا کرتے تھے۔

چندن اپنے بڑے بھائی اور پنڈت جی کے بڑے لڑکے کے ساتھ کبھی کبھی زہرہ کے چوبارے پر چلا جاتا تھا۔

زہرہ پنڈت جی کے لڑکے کو پیار کیا کرتی تھی۔ مٹھائی وغیرہ دیتی تھی اور اس کا کچھ جوٹھا حصہ ان دونوں بھائیوں کو بھی ملا کرتا تھا۔ کئی بار وہ دوسرے بچوں کے ساتھ چوبارے کے باہر آنگن میں کھیل رہا ہوتا اور سیٹھ جی زہرہ کے پاس جا بیٹھتے اسے آغوش میں لے لیتے یا اس کے زانوؤں پر سر رکھ کر لیٹ جاتے۔

اس کی یہ مالکن بھی تو زہرہ سے ملتی جلتی تھی۔ ویسا ہی بوٹا سا قد۔ ویسے ہی بھرے بھرے کولہے۔ اُٹھی ہوئی چھاتیاں۔ گول گول رس بھرے گال۔ بڑی بڑی مسکراتی

آنکھیں اور گیلے ہونٹ کون کہہ سکتا ہے کہ اس ایک لمحہ میں مالک کے پہلو میں اسے لیٹے ہوتے دیکھ کر ہی اسے زہرہ کی یاد نہ آگئی تھی۔

تصور ہی تصور میں چندن زہرہ کے بالاخانے پر پہنچ کر سیٹھ کی طرح اس کے زانوؤں پر لیٹ گیا۔ اور زہرہ پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی..... وہ بھول گیا کہ اس کے ٹخنوں تک میل چڑھی ہوئی ہے۔ خشکی کے باعث ٹانگوں کی جلد گھٹنوں تک پپڑی سی بن گئی ہے۔ اس کا نیلا تہمد جو اس کے مالک نے مدت ہوئی دیا تھا میل سے کالا ہو گیا ہے۔ اس کی قمیض کئی جگہ سے پھٹی ہوئی ہے۔ اس کے سانولے ماتھے پر چوٹ کا ایک نہایت بدنما داغ ہے۔ اس کا نچلا ہونٹ کٹا ہوا ہے اور اس کے سر کے بال چھوٹے چھوٹے کھڑے کھڑے اور روکھے ہیں... وہ مست لیٹا رہا اور زہرہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی..... وہیں اس کے زانوؤں پر لیٹے لیٹے اس نے کروٹ بدلی۔ اور پیار سے کہنا چاہا۔ "زہرہ تم کتنی اچھی ہو..." لیکن اس کی کمر میں کوئی سخت سی چیز چبھی اور اس وقت اسے معلوم ہوا کہ وہ ننگے فرش پر لیٹا ہوا ہے۔ وہ چیز جس پر اس کا سر رکھا ہے زہرہ کا زانو نہیں بلکہ ایک بوسیدہ سڑا گلا تکیہ ہے۔

چندن نے سر کو جھٹکا دیا۔ لیکن وہ مسکرایا نہیں۔ اٹھ کر دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں کے سامنے پچھلے کئی برس اڑتے ہوئے سے گزر گئے۔

سیٹھ جی تو اپنی سب جائداد چوباروں کے حسن کی نذر کر کے اپنے نانا کے گاؤں چلے گئے تھے۔ جو وسط پنجاب میں کہیں اپنی سادگی، غلاظت اور ناخواندگی کی گود میں

لیٹا ہوا تھا۔ چندن کی موسی الور اپنے گاؤں چلی گئی تھی اور چندن اس چھوٹی عمر ہی میں تین روپے ماہوار پر ان سیٹھ صاحب کے ایک دوست کے ہاں نوکر ہو گیا تھا۔

اس کے بعد اس کی زندگی اس کمبل کی طرح تھی جسے ایک جگہ سے رفو کیا جاتے تو دوسری جگہ سے پھٹ جاتے۔ دوسری جگہ سے سیا جاتے تو تیسری جگہ سے چاک ہو جاتے۔ اپنے اس مالک کے ہاں پہنچ کر اس نے سکھ کا سانس لیا تھا ——— اور محسوس کیا تھا کہ ایسا زندہ دل خوش مزاج ——— اور کھلی طبیعت کا مالک گزشتہ بارہ سال کی نوکری میں اسے نہیں ملا۔ لیکن اس کے مالک کی یہی کھلی طبیعت اس کے لئے مصیبت بن گئی تھی۔ اس کا مالک اس کے سامنے ہی اپنی بیوی کو پیار کرنے میں ذرا بھی نہ جھجکتا تھا۔ جیسے چندن گوشت پوست کا انسان نہ ہو ا، مٹی کا لوندا ہو۔

چندن نے سوچا اس شادی سے پہلے وہ اطمینان سے رہتا تھا۔ یہ بے چینی سی یہ گھٹن سی یہ اعضا کا تناؤ سا، یہ شب بیداری سی۔ اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ پہلے وہ سوتا تھا تو اسے دین دنیا کا ہوش نہ رہتا تھا۔ لیکن جب سے اس کے مالک نے شادی کی تھی اور اس کی یہ نئی مالکن آئی تھی۔ اس کی نیند اڑ سی گئی تھی۔ اسے عجیب عجیب طرح کے خواب آتے تھے۔ رات اس نے کاسنی کو دیکھا تھا۔ کاسنی اس کے پہلے مالک کی لڑکی تھی۔ کچی ناشپاتیوں کی سی اس کی چھاتیاں تھیں۔ ٹخنوں سے اونچا لہنگا اور بنڈی پہنے وہ ننگے سر گھوما کرتی تھی۔ یہی لڑکی خواب میں اس کے ساتھ آلیٹی تھی کیسے؟ کہاں؟ اسے کچھ یاد نہیں۔ لیکن وہ جاگ اٹھا تھا۔ اس کا جسم گرم تھا۔ اس کے اعصاب تنے ہوتے تھے۔ اسے پسینہ آ گیا تھا ... پھر وہ سو نہ سکا تھا۔

کچھ بھی سمجھ میں نہ آنے سے اپنی بے وقوفی پر اس نے سر ہلایا لیکن وہ مسکرایا نہیں۔

اس کا مالک دفتر گیا ہوا تھا۔ مالکن اندر کمرے میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ وہ اٹھا اور پڑوس میں رائے صاحب کے نوکر جیٹھو کی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔

چیت کی پورنماشی کا چاند ٹبر کے پیچھے سے آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔ نوعمر کیکری کے پتّے اس کی کرنوں کے لمس سے چمک اٹھے تھے۔ چیندن آہستہ آہستہ اپنی کوٹھڑی سے نکلا۔ سامنے کوٹھی کے پورچ پر پھیلے ہوئے دوگن بیلیا کے سُرخ گل اناری پھول چاندنی میں ہلکے سیاہی مائل معلوم ہوتے تھے۔ ایک طرف گل مور کا پرانا درخت جس کا تنا پار سال درمیان میں سے کاٹ دیا گیا تھا، اپنی چند ایک شاخوں کے سروں پر پتّوں اور پھولوں کے گچھے لئے جھوم رہا تھا۔ دور سے یہ گچھے بادلوں کے ننھے ننھے پارے سے معلوم ہوتے تھے۔ گگروندے اور کرنے کے پھولوں کی خوشبو فضا میں بسی ہوئی تھی۔ اگرچہ ابھی تک وہ سب اندر کمرے میں سوتے تھے لیکن آمد بہار کے باعث سردی زیادہ نہ رہی تھی۔ چیندن ایک عالم محویت میں گوندنی کے درخت کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے بے خیالی میں ایک دو ننھی ننھی گوندنیاں توڑ کر منہ میں ڈال لیں۔ پوری طرح پکی نہ تھیں اس کا منہ بے مزہ ہو گیا۔ ایک لمحہ تک وہ ششش و پنج کی سی حالت میں وہیں کھڑا رہا۔ پھر وہ برآمدے میں گیا۔ اور اس نے بڑی احتیاط سے دیوان خانے کا دروازہ کھولا سونے کا کمرہ مردانے کے ساتھ ہی تھا اور دیوان خانہ عام طور پر کھلا رہتا تھا۔ اس کا ایک دروازہ باہر سے بند کر لیا کرتا تھا اور ایک اس کے مالک اندر سے بند کر لیتے تھے۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ مالک کے سونے کے کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی۔ اس کا عکس دروازے کے شیشے پر پڑ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا

تھا۔ جیسے کسی نے گملی روشنی کا برش دروازے کے شیشوں پہ پھیر دیا ہو۔ آہستہ آہستہ دری پہ پاؤں رکھتا ہوا چندن بڑھا اور جا کر دروازے کے ساتھ پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔

اندر چھت میں لال رنگ کا بلب روشن تھا۔ اس کی مدھم روشنی میں وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ بھاگا۔ اس کا جسم گرم ہونے لگا تھا۔ اعضا تننے لگے تھے۔ اس کا گلا اور ہونٹ خشک ہو گئے تھے اور اس کی نسوں میں جیسے دودھ اُبلنے لگا تھا۔

پنجوں کے بل بھاگ کر وہ باہر آیا۔ آہستہ سے اُس نے دروازہ بند کیا اور باہر چاندنی میں آ کھڑا ہوا۔ سامنے گُل مور کا تنا کھڑا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کی ایک ہی ضرب سے وہ تنے کو گرا دے۔

کوٹھی کے سامنے لان میں فوارے کے گرد سرخی مائل پیلے پیلے پھولوں کے بے شمار پودے لہرا رہے تھے۔ جن کے چوڑے چوڑے پتوں پہ پانی کی بوندیں پھسل پڑا کرتی تھیں۔ گلگوندے کی خوشبو اور بھی تیکھی ہو کر فضا میں بس گئی تھی۔ چندن نے جا کر فوارے کی ٹونٹی گھما دی۔ پھر پھر ایک میٹھی سی پھوہار اس پر پڑنے لگی۔ وہ جیٹھو کے ہاں کیوں گیا؟ وہ سوچنے لگا —— دوپہر کے وقت ارد گرد کی کوٹھیوں کے نوکر جیٹھو کی کوٹھڑی میں جمع ہوتے تھے۔ کبھی تاش کھیلتے کبھی چوسر کی بازی لگاتے۔ کبھی اپنے اپنے مالکوں اور مالکنوں کی نقلیں اتارتے۔ کبھی کبھار جیٹھو اپنے چچا سے ایک پرانا گراموفون مانگ لاتا جو اس نے کبھی ایک کباڑی کی کلیرنگ سیل میں خریدا تھا۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے اسہال کا مریض بچہ رو رہا ہو۔ لیکن وہ سب مزے سے اس

پر "گوری تیرے گورے گال پہ" یا "دو تو سے لاگی نجریا رے" سنا کرتے۔ حال ہی میں جیٹھو چارلی کا ایک نیا ریکارڈ لے آیا تھا اور دوپہر بھر اس کی کوٹھڑی میں "دو تیری نظر نے مارا"

دتیری نظر نے مارا۔

ایک۔ دو۔ تین چار۔ پانچ چھ۔ سات آٹھ۔ نو دس گیارہ۔

تیری نظر نے مارا)

ہوتا رہتا۔ لیکن چندن کبھی ادھر نہ گیا تھا۔ اسے وقت ہی نہ ملتا تھا۔ صبح سویرے ہی اس کا مالک اسے جگا دیا کرتا تھا۔ وہ اس کے مالش کرتا۔ اس کے لئے نہانے کا پانی تیار کرتا۔ چائے بناتا۔ اس کے دفتر چلے جانے کے بعد دوپہر کے کھانے کا انتظام کرتا۔ کھانا بنا کر دفتر لے جاتا آکر نہاتا۔ کھاتا اور سو جاتا ـــــ ایسی گہری نیند سوتا کہ بارہا غروب آفتاب تک سوتا رہتا اور اس کے مالک کو ٹھوکریں مار مار کر اسے جگانا پڑتا۔ لیکن آج اپنی بے خوابی سے ہار کر جب وہ دوپہر کو جیٹھو کی کوٹھڑی میں گیا تو اس نے ایسی باتیں سنیں کہ اس کی رہی سہی نیند بھی حرام ہو گئی۔

پھوہار کے پڑتے ہی اس کے جسم میں جھرجھری سی اٹھی وہ ذرا چونکا۔ کہیں اسے بخار تو نہیں ہو گیا۔ رُت بدل رہی ہے۔ اور وہ پانی کے نیچے کھڑا بھیگ رہا ہے اگر نمونیا ہو گیا تو! اس نے سر کو ایک بار جھٹکا دیا لیکن مسکرایا نہیں اور فوارے کو کھلا چھوڑ کر ہی اپنی کوٹھڑی میں جا کر لیٹ گیا۔

لیکن جلد ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا سر بھاری بھاری تھا۔ جسم پر بخار کی سی کیفیت طاری تھی اور آنکھیں کچھ جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے پھر

ایک خواب دیکھا تھا کچی ناشپاتیوں کے گچھے اس کے سر کے گرد گھوم رہے ہیں۔ وہ ایک ویران سے مکان میں کھڑا انہیں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پاس ہی پانی کا نل چل رہا ہے۔ اور اس کے پاس ایک بچہ کھڑا چلا چلا کر کہہ رہا ہے۔ "میرا کھلونا مت توڑو" وہ سر اٹھا کر ادھر دیکھتا ہے۔ وہ بچہ کاسنی بن جاتا ہے اور وہ سنتا ہے۔ "میری ناشپاتیاں مت توڑو۔ میری ناشپاتیاں..."

چندن پاگلوں کی طرح اٹھا۔ جبیٹھو کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج گئے۔ اس نے کرتہ پہنا مٹی کے ایک پرانے میلے کونڈے میں سے خستہ سا بٹوا نکال کر جیب میں رکھا کوٹھڑی کو کنڈی لگائی اور آہستہ آہستہ کوٹھی سے باہر نکل گیا۔

چاندنی ایک وسیع شامیانے کی طرح پریڈ گراؤنڈ پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور سڑکوں کے نیم جیسے اس شامیانے کو تھامے کھڑے تھے۔ ان کے گھنے پتوں میں سے بجلی کے قمقمے ٹمٹما اٹھتے تھے۔ اور دور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ان درختوں کے پرے کوئی الاؤ جل رہا ہو۔

چندن کوئین میری روڈ پر ہو لیا۔ دائیں طرف کوٹھی سے گگروندے کونے۔ گل شبو اور مولسری کی ملی جلی مہک کا ایک جھونکا آیا۔ اور سڑک پر درختوں کے نیچے بچھے ہوئے روشنی اور سائے کے جال ہلے۔

تیس ہزاری کے چوراستے پر وہ رکا کہ شاید کوئی بگھی آتی ہوئی مل جائے۔ لیکن شاید گیارہ کبھی کے بج چکے تھے۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ ایک گندگی کی گاڑی عفونت پھیلاتی ہوئی اس کے پاس سے گزر گئی۔ چندن کا دماغ بھنا گیا۔ بھاگ کر وہ مٹھائی کے پل پر ہو

لیا جس چبوترے پر سپاہی کھڑا رہتا ہے وہ ٹوٹا ہوا تھا۔ شاید کسی موٹر والے نے سپاہی کی کوتنگی کا بدلہ اس معصوم چبوترے سے لیا تھا۔ پل پر بالکل سناٹا تھا۔ اوپر چاند چمک رہا تھا۔ اور پل کے نیچے گہرائی اور تاریکی میں ریل کی لائنیں اور سامنے کچھ دور لال سگنل چپ چاپ ٹمٹما رہے تھے۔ چندن پل کی دیوار کے ساتھ سر لگائے لمحہ بھر تک مبہوت وساکن ان ناگنوں سی لائنوں اور ان ٹمٹماتے ہوئے سگنلوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ آگے چل پڑا۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ دونوں طرف کی دکانیں بند تھیں۔ اور پٹڑی پر کہیں کہیں میلے سے لحاف لئے دکاندار سوتے ہوتے تھے —— میلی کچیلی دھوتیوں میں ان کے زرد زرد اعضا پورن ماشی کے چاند کی اس روشنی میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ تیلی باڑے کے سامنے پٹڑی پر ایک ٹوٹا ہوا تانگہ پڑا تھا۔ اور دو تین کوڑا اٹھانے والی خالی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بائیں طرف دور تک ایک سفید سی دیوار چلی جاتی تھی جس کے پیچھے کبھی کسی گاڑی کے تیز تیز گزرنے کی آواز آجاتی تھی۔ اور دائیں طرف دکانوں کے باہر کہیں بانسوں کے گٹھے پڑے تھے۔ کہیں چارپائیاں اور کہیں لکڑی کی خالی پیٹیاں ! چندن چپ چاپ اپنے خیالات میں محو قطب روڈ کے چوراہے پر آگیا۔

صدر بازار بالکل بند ہو چکا تھا۔ صرف کونے کے حلوائی کی دکان کھلی تھی۔ چندن کی بھڑکی ہوئی طبیعت یہاں تک آتے قریب قریب ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ صرف اس کے دل میں ایک ہلکا سا اشتیاق کا جذبہ موجود تھا۔ اور اسی کے ماتحت اس نے حلوائی کی دکان سے آدھ سیر گرم گرم دودھ پیا۔ پھر جیسے ایک نئی امنگ پاکر وہ اور آگے بڑھا۔

دونوں طرف کی دکانیں بند تھیں۔ بائیں طرف کے ماشاء اللہ ہوٹل میں ہوٹل کا ایک ملازم بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ دائیں بائیں کہیں کہیں کسی پنواڑی یا حجام کی دکان کھلی تھی۔

ایک دکان میں ایک مزدور (جسے دن میں شاید فرصت نہ ملتی تھی) بیٹھا سر پہ استرا پھروا رہا تھا۔

کاٹھ بازار کے سرے پر چندن ایک لمحہ کے لئے رکا۔ تانگوں کے اڈے پر ایک دو تانگے والے ابھی گھوم رہے تھے۔ تانگہ شیڈ کے عین اوپر چاند چمک رہا تھا اور اس چاندنی میں گرد اور دھوئیں کا ہلکا سا غبار بھی ملا ہوا تھا۔ وہ کاٹھ بازار میں داخل ہوا اور تیران سا ایک چوبارے کی طرف دیکھنے لگا۔ جس میں گیس کی روشنی کے سامنے ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی چندن کی مری ہوئی امنگ بھر جاگی۔ لیکن یہاں ابھی تک کئی آدمی کھڑے تھے۔ اتنے آدمیوں کے سامنے۔ اتنی روشنی میں اس کے لئے معاملہ کی بات کرنا مشکل تھا۔ اس نے نیچے کی کوٹھڑیوں کی طرف دیکھا۔ ہر ایک کوٹھڑی کے آگے ایک لیمپ لٹک رہا تھا۔ اور ایک عورت کھڑی یا بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی کسی کوٹھڑی کا دروازہ بند ہو جاتا اور کسی شخص کے پیچھے لیمپ اٹھاتے اس کوٹھڑی کی عورت ایک میلے سے پردے کے اندر چلی جاتی تھی۔ لمحہ بھر کے لئے ابھری ہوئی امنگ چندن کو پھر ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی وہ ذرا آگے بڑھ کر ایک لوہے کی کرسی پہ بیٹھ گیا، جو عین چوک میں بچھی ہوئی تھی۔ اور جس کے پاس ایک میز پہ رنگ برنگی بوتلیں رکھے ایک دو چمپی کرنے والے بیٹھے تھے۔

"چمپی کراؤ گے۔"

چندن نے غیر ارادی طور پہ سر ہلا دیا۔ پاس ہی ایک اور ایسی دکان تھی اور اس کے ساتھ بچھے ہوئے بنچ پر ایک شخص بیٹھا چمپی کروا رہا ہے۔ اس کے پرے ایک لمبے برآمدے میں اپنی اپنی کوٹھڑیوں کے سامنے عورتیں کھڑی اپنے گاہکوں کو بلا رہی تھیں۔ تھک جانے یا سینے کا ابھار دکھانے کے خیال سے انہوں نے چھت سے

رسیاں ٹکا رکھی تھیں۔ جن کے سہارے وہ کھڑی تھیں۔

چندن کے سر میں تیل کے گرنے سے بجلی کی سی سرسراہٹ ہوتی اور پھر حجام لڑکا چمپی کرنے لگا۔ چمپی کرنے کے بعد اس نے چندن کی پیشانی اور گردن کو ایک میلے سے تولیے سے پونچھ کر اس کے بال بنا دیئے۔

چندن جب وہاں سے اٹھا تو اسے ناک میں سستے خوشبودار تیل کی تیکھی سی بُو آ رہی تھی۔ اور اس کی اُمنگ پھر جیسے بیدار ہو گئی تھی۔ چوک چھوڑ کر وہ ایک گلی میں ہو گیا۔ یہاں لوگ کم تھے۔ اور روشنی بھی اتنی زیادہ نہ تھی۔ وہ ایک گلی کے دوسرے سرے تک جا کر مڑ آیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیسے بات چیت شروع کرے۔ وہ تو ان سے آنکھیں بھی نہ ملا سکتا تھا۔ محض خیال ہی سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا تھا اس نے سوچا واپس چلا جاتے اسے جیٹھو کے ساتھ آنا چاہیئے تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ گلی میں سے ہوتا ہوا دوسری طرف سے نکل جاتے گا۔ مگر اتنی دور آ کر وہ یوں ہی واپس جانا بھی نہ چاہتا تھا۔ اسی وقت ایک کوٹھڑی کے آگے قدرے اندھیرے میں بیٹھی ہوتی ایک موٹی سی تھل تھل پل پل عورت نے اس کی مشکل حل کر دی۔ اس کے پاس دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں فرش پر ہی دری بچھاتے لیٹی ہوتی تھیں۔ بالکل کاسنی ہی کے سن کی۔

"آؤ ادھر آؤ۔" پیار سے اس نے کہا۔

چندن بڑھا۔

سرگوشی میں اس نے کہا۔ "آؤ سوچتے کیا ہو۔ بارہ آنے لگیں گے۔"

اشارہ اس کوٹھڑی کے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوتی عورت کی طرف تھا۔ جو صرف ایک بنیان اور کالی ساڑھی پہنے بیٹھی تھی۔ جس کی بغلوں کے بال تک نظر آتے تھے! وہ

جس کی چھاتیاں مرجھائی ہوئی ککڑیوں کی طرح لٹک رہی تھیں۔

چندن نے اس کے پاس فرش پر آدھی لیٹی اور آدھی بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھا جس کے ناک میں ایک چھوٹی سی نتھ تھی۔

سمجھ کر موٹی عورت نے کہا۔ "یہ تو ابھی چھوٹی ہے۔ یہ ابھی یہ باتیں کیا جانے۔"

چندن کے دماغ میں کچی ناشپاتیاں گھوم گئیں۔ پھر کاسنی اور پھر کچی ناشپاتیاں اور موٹی عورت نے کہا۔ "دو روپے لگیں گے۔"

چندن چپ رہا۔ وہ کہنا چاہتا تھا۔ "دو روپے بہت ہیں۔"

تبھی موٹی عورت نے کہا۔ "اچھا تو ڈیڑھ روپیہ ہی دے دو۔ ابھی تو نتھ بھی نہیں اتری۔"

چندن کی نسوں میں دودھ ابلنے لگا۔ اس کا جسم گرم ہونے لگا۔ دوسرے لمحے وہ اس میلے پردے کے اندر چلا گیا اور اس کے پیچھے اس لڑکی کو لئے ہوئے وہ موٹی عورت ...

ایک ہفتے کے بعد سر پر اپنا بوریا بستر اٹھائے چندن پورچ میں کھڑا تھا اور اندر کمرے میں اس کا مالک اپنی بیوی کو ہدایت دے رہا تھا۔ "میں ابھی ڈاکٹر کو بھیجتا ہوں سارے گھر کو ڈس انفیکٹ کروا لینا۔ سب جگہ تو جا تا رہا ہے کمبخت!"

اور چندن بے بسی کی حالت میں کھڑا سوچ رہا تھا۔ لیکن لڑکی کی عمر تو تیرہ سال کی بھی نہ ہوگی اور اس کی تو ابھی تک نتھ بھی نہ اتری تھی۔

بیداری کے خواب

...اور میں ہمیشہ تین لاکھ کے خواب دیکھتا ہوں۔ سوتے میں اور کئی بار چلتے چلتے بھی یہ خواب دیکھا کرتا ہوں۔ میں نے آج تک کبھی لاٹری کا ٹکٹ نہیں خریدا لیکن پھر بھی مجھے اچانک لاٹری ہی سے تین لاکھ روپے مل جاتے ہیں۔ اور میں چلتے چلتے، بارہا چلچلاتی دھوپ اور بارہا ہوا کی تندی کو بھول کر کسی خوبصورت وادی میں اپنا کنجِ عافیت بنانے میں محو ہو جاتا ہوں۔ اس چھوٹے سے کنج میں پڑھنے کیلئے ایک چھوٹی سی لائبریری ہوتی ہے۔ سیر کرنے کے لئے ایک ننھا سا پائین باغ ہوتا ہے۔ اور میں کسی حسین، بھولی بھالی لڑکی سے محبت کرتا ہوں۔ رشتہ داروں کے لئے کافی روپیہ چھوڑ کر میں وہیں اپنے اس آشیانے، میں جا بستا ہوں۔ تنہائی سے طبیعت اکتا نہ جائے۔، اس خیال سے شہر میں بھی اپنا ایک ایسا ہی نشیمن بناتا ہوں۔ بنک سے مجھے گزر اوقات کے لئے کافی

سود ملتا ہے۔ اور اپنے ان دونوں نشیمنوں میں زندگی بسر کرتا ہوا میں ادب کی خدمت میں محو ہو جاتا ہوں۔ کتابوں پر کتابیں لکھتا ہوں۔ اور میرا نام ہندوستان کی حدود کو پار کر کے...
لیکن میرے ان سپنوں میں بھی یہ تصویر کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ میں تفاصیل میں الجھ جاتا ہوں ۔۔۔ میری بیوی ہے۔ بچے ہیں اور پھر بھائی بہنیں۔ اور... اور...
اور اس روز کی پورن ماشی کو جب چاند کی کرنوں میں ہلکا سنہرا پن ہویدا تھا اور تار کول کی سڑک کہیں کہیں پر سراب سی چمک جاتی تھی۔ میں چلتا چلتا ایسے ہی بیداری کے سپنے میں کھو گیا تھا۔

میں سبزی منڈی سے پانچ چھ آنے کے پیسے (اور اگر کچھ مل سکیں تو کچھ دھیلے) لانے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ اچانک معلوم ہوا تھا کہ آج چاند گرہن ہے۔ اور ماں نے کہا تھا کہ کچھ پیسے یا دھیلے لے آؤ۔ کوئی بھکاری دکاری ہی آجاتا ہے۔
مجھے بھکاریوں سے چڑ ہے۔ غلیظ کریہہ منظر عفونت زدہ۔ گندے مکروہ بھکاریوں سے ان کی صورت میری جمالیاتی حس کو صدمہ پہنچاتی ہے۔ یا انہیں دیکھ کر میرے ذہن سے کائنات کی خوبصورتی کے نقش دھندلے پڑنے لگتے ہیں۔ یا پھر ان کیڑوں کی طرح رینگتے ہوئے انسانوں کو دیکھ کر میں جماعتی بدتری کے متعلق غور کرنے لگتا ہوں؟۔۔۔
میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ کہ کسی بھکاری کو دیکھتے ہی میری آنکھوں کے سامنے کئی گھناؤنے مناظر ایک ساتھ پھر جاتے ہیں۔۔۔
... میں حلوائی کی دکان پر بیٹھا ہوتا ہوں۔ مجھے صبح صبح پیڑے اور دہی کی لسی پینے کی عادت ہے۔ جب تک لسی بن کر میرے سامنے نہیں آجاتی۔ مجھے قرار نہیں آتا۔ چاہتا ہوں

حلوائی سے کہہ دوں۔ "بس کرو۔ زیادہ نہ متھو۔" لیکن اگر دہی کو ٹھیک طرح نہ بلویا جائے تو بالائی نہیں مرتی۔ پھٹکیاں تمام لطف کرکرا کر دیتی ہیں اور یوں بھی اگر لسّی میں پیڑے ملائے جائیں اور مکھن نکالنا مقصود ہو، تو دیر کچھ زیادہ ہی لگ جاتی ہے۔ خدا خدا کر کے لسّی تیار ہوئی۔ گلاس کے اوپر مکھن کی تہ اور لسّی کی سفید جھاگ سے آنکھوں کو طراوت سی آنے لگتی ہے۔ حلوائی اس پر کیوڑا چھڑک کر مکھن پر چمچہ رکھ دیتا ہے۔ لیکن ابھی گلاس کو ہونٹوں سے نہیں لگا پاتا کہ پیچھے سے گردن پر ہوا کا جھونکا سا آن لگتا ہے اور کانوں میں ان گنت مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح درد بھری سی صدا گونجنے لگتی ہے۔ "ایک پیسہ دلوا دو بابو تمہاری نوکری بنی رہے۔۔۔"

مجبوراً ایک بار دیکھ کر پھر نظر پھیر لیتا ہوں۔ لیکن لسّی حلق کے نیچے اترنے سے انکار کر دیتی ہے۔ روکھے خشک الجھے بال۔ آنکھوں میں چیپڑ، دانتوں پر زردی اور میلے اور چیکٹ کپڑے ۔۔۔ ایک بھکارن پنکھی سے ہوا کرتی ہوئی کہتی ہے ۔۔۔ "بابو ایک پیسہ ۔۔۔" کیوڑے کی خوشبو مر جاتی ہے اور خوش ذائقہ لسّی کے گھونٹ زہر کے گھونٹ بن جاتے ہیں ۔۔۔"

۔۔۔ سخت بھیڑ سے گزر کر کسی نہ کسی طرح اپنے بچے کو سنبھالے۔ اپنی بیوی اور قلی پر نگاہ رکھتا ہوا میں اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے نکلتا ہوں۔ اور تانگے والوں کے نرغے میں پھنس جاتا ہوں۔ کوئی ٹرنک کھینچتا ہے، کوئی بستر، کوئی گٹھڑی۔ بچہ گھبرا کر رونے لگتا ہے۔ بیوی پریشان سی کھڑی رہ جاتی ہے۔ گردن اور ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے میں تانگے والوں سے جھگڑتا ہوں کہ ۔۔۔ "تیری سندر صورت پہ مر جاؤں رے بابو"۔۔۔ "تیری کٹیلی عینک پہ مر جاؤں رے بابو" کا گیت گاتی ہوئی ٹخنوں سے اونچا،

میلا پھٹا، ننگا اور خستہ اور بوسیدہ بنڈی پہنے، ایک لڑکی میرے ارد گرد گھومنے لگتی ہے اور "مائی تیرا بچہ جیوے... "مائی تیرا مالک جیوے"، کی تان لگاتی ہوئی اس کی بہن میری بیوی کو گھیر لیتی ہے ــــ میں زور زور سے چیختا ہوں۔ لیکن کہیں تانگے والوں کے شور و شغب کے اوپر سے میرے کانوں میں لگاتار یہ آوازیں آتی رہتی ہیں... "تیری سندر صورت ـــــ" اور پھر...

"مائی تیرا بچہ..."

... اور کبھی کوئی ننگ دھڑنگ لڑکا، پیٹ پہ ہاتھ مارتا ہوا، "باپ مر گیا۔ قسمت پھوٹی" کی صدا لگاتا تپتی سڑک پر ننگے پاؤں میرے تانگے کے پیچھے بھاگتا ہے۔ میں تانگے کو تیز چلنے کا حکم دیتا ہوں۔ وہ بھی تیز ہو جاتا ہے۔

... اور کبھی سڑک کے کنارے گڑگڑاتے، روتے، بلبلاتے، تھوک اور غلاظت میں لت پت، ٹانگوں پہ تیل سے سنی پٹیاں باندھے، کسی فقیر کو فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے دیکھتا ہوں۔

... اور کبھی جب میں دوپہر کو دفتر سے کام کر کے چاندنی چوک سے ہوتا ہوا گھر کو لوٹتا ہوں۔ تو مجھے بارہا ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں ایک سونے بازار سے گزر رہا ہوں۔ مجھے چاندنی چوک کی چہل پہل، شان و شوکت اور بھیڑ بھاڑ نہیں دکھائی دیتی۔ میں دیکھتا ہوں ـــ کسی بند دکان کے تختے سے اٹھ کر کوئی اندھا بھکاری، جیسے زمانے برسوں گزر گئے ہوں، ڈگ ڈگ کر ماپ ماپ کو قدم رکھتا ہوا کسی نیم جان کے پیڑ کے نیچے جا بیٹھتا ہے بے حس اور بے جان، یا پھر بجلی کے درخت کے نیچے کوئی ادھیڑ عمر کی بھکارن اپنے روکھے الجھے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سلجھاتی ہے اور سینما ہال کے

باہر تنوروں اور خوانچہ فروشوں کے ارد گرد بھوکے کتوں کی طرح بیٹھے ہوئے بھکاری یا ان کے بچے وزدیدہ نگاہوں سے روٹی کے نوالوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

اُفق پہ چھایا ہوا غبار جس طرح خشک اور گرم شاموں کی اداسی اور حبس میں اضافہ کر دیتا ہے، اسی طرح یہ تمام مناظر میری مکدّر طبیعت کو اور مکدّر بنا دیتے ہیں ــــ اور میں کسی فقیر کو پیسہ نہیں دیتا۔ ایک کو ایک پیسہ دے کر بیسیوں کو انکار کر دینا میرے لئے مشکل ہے۔ اور پھر ایک تانبے کا پیسہ، پاؤ آدھ پاؤ آٹا، یا چنے کے چند دانے اس جماعتی مرض کا علاج بھی تو نہیں ... اور میں خواب دیکھا کرتا ہوں۔ تین لاکھ کے خواب ... اس غلاظت، عفونت، بدصورتی، جماعتی بدتری، غیر مساوات، بیکاری، مفلسی مفلوک الحالی سے دور ــــ حسن خوبصورتی آرام و آسائش کے خواب!

لیکن ماں تو ایسے خواب نہیں دیکھتی۔ اپنی موجودہ حالت ہی پہ وہ شاکر ہے اور دوار پہ آنے والے ہر ایک بھکاری کے لئے اس کے بھنڈارے میں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ پھر وہ باسی روٹی ایک کٹوری بھر آٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے جب کچھ دیر پہلے نوکر نے آکر بتایا کہ آج چاند گرہن ہے۔ اور نندر نے باہر سے آکر اس بات کی تصدیق بھی کر دی کہ دس اڑتالیس پہ گرہن لگے گا۔ تو ماں نے جلدی کا شور مچا دیا۔ کہ فوراً کھانا ختم کیا جائے تاکہ وہ نہا کر پوجا کے لئے تیار ہو جائے۔

ہم نے نہائے بغیر جلدی جلدی روٹی ختم کی۔ ماں نے وِدّی اور دِدّی کے تنہا گوشے میں بنے ہوئے ان کوارٹروں کو کوستے ہوئے کہا۔ "اس نگوڑی جگہ دن وار تہوار تقریب کا کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔ آج چاند گرہن ہے۔ اگر کہیں اس بات کا پہلے پتہ لگ جاتا تو رسوئی وغیرہ سے نبٹ کر جمنا جی میں جا کر دو ڈبکیاں ہی لگا لیتے۔"

ڈبکیاں --- میں من ہی من میں ہنسا --- غم روزگار کے بھنور ہی کیا کم ہیں جو کسی دوسرے دریا میں جاکر ڈبکیاں لگانے کی ضرورت پڑے۔ اس کے پانیوں سے اُبھریں، تو کہیں اور جاکر غوطے لگانے کی امنگ پیدا ہو۔ اور کلّی وغیرہ کر کے میں باہر جانے کو تیار ہوا تھا --- اتنی چاندنی تھی کہ گھر میں بیٹھے رہنا گناہ کے مترادف معلوم ہوتا تھا۔ اور پھر کچھ طبیعت بھی بھاری تھی۔ ماں نے میری بھوک کے متعلق اپنے معیار سے کھانا کھلایا تھا خیال تھا کہ سبزی منڈی سے کھاری یا کھاری میٹھے سوڈے کی ایک بوتل ہی پی آؤں گا۔ جب چلنے لگا تو ماں نے کہا کہ وہیں سے کچھ پیسے یا دھیلے بھی لیتے آنا۔ میں نے کہا تھا "جو ہے میں پانچ چھ آنے ہیں" --- ماں بولی۔ "آنے نہیں چاہئیں پیسے یا دھیلے چاہئیں۔ کوئی منگتا بھکاری ہی آجاتا ہے"۔

اسوج کی پورنماشی کا سنہری مائل سفید چاند کنارے کے نیم کی شاخوں میں لٹکتا، الجھتا چھپتا، چھنتا، برف خانے کے دھوئیں میں سے پیلا پڑ کر نکلتا، ہلکے سفید بادلوں پر تیرتا میرے ساتھ ساتھ چلا آتا تھا۔ سبزی منڈی کی زیر تعمیر عمارت اور ادھر ادھر بکھرے بے ترتیب اینٹوں کے ڈھیر، فٹ پاتھ پر لگی ہوئی گھڑوں اور مٹکوں کی سوئی ہوئی دکان پرے اجیت گڑھ کا مینار، سامنے دور تک بجلی کے قمقموں کی قطار اور سڑک کے کنارے درختوں کے نیچے روشنی اور سائے کے جال کچھ عجیب خواب کا سا اثر رکھتے تھے اور میں پھر کسی پہاڑ پر اپنا نشیمن بنانے میں محو ہو گیا تھا۔

میں نہیں جانتا کب ان جانی فضاؤں سے یہ بیداری کے خواب میرے دماغ پر اُتر آتے تھے۔ میں ایک دم تین لاکھ روپیہ پا جاتا ہوں۔ اور پھر چلتا چلتا اپنے دھیان

ہیں گم اس کے استعمال کی سکیمیں بنانے لگتا ہوں۔

بڑے زور سے ٹریم کی گھنٹی بجی۔ اور ڈرائیور چیخا۔ اور میں ٹھیک کہ فٹ پاتھ پر ہو گیا اس بال بال بچ جانے پر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور پنڈلیاں کانپنے لگیں میرے یہ خواب ... میں ضرور کسی موٹر میں، ٹریم یا تانگے کے نیچے آ کر مروں گا ... میں نے لمبا سانس لے کر اپنے ارد گرد دیکھا ــــ میں منڈی دروازے کے پاس تھا۔ بازار کا یہ حصہ کافی غلیظ ہے۔ دور و یہ چھوٹی چھوٹی سی دکانیں۔ گھنٹہ گھر تک چلی گئی ہیں۔ جن میں موچیوں، پنواڑیوں اور حلوائیوں کی کثرت ہے۔ کچھ اچھی دکانیں بھی ہیں لیکن ان کی تعداد چنوں میں گیہوں کے برابر ہے۔ بازار اگرچہ کشادہ ہے۔ لیکن پھر بھی اس میں سے گزرتے وقت کافی کوفت ہوا کرتی ہے ــــ بار ہا برف خانے کا دھواں اس پر چھایا ہوتا ہے۔ اور کبھی یہ دم لیتا ہے تو پرے سبزی منڈی کے دوسرے سرے پر بل کی چمنی سیاہ بادل اُگل رہی ہوتی ہے۔ یا پھر موٹریں، ٹرامیں، تانگے چھکڑے، سبزی اور پھلوں کی گاڑیاں دُھول اُڑاتی رہتی ہیں اور غریب مزدور سر پر اوندھے ٹوکرے دھرے مزدوری کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں۔ اور حلوائیوں اور تنوروں کی بھٹیوں کے زہریلے دھوئیں اور سبزی منڈی کے گلے سڑے پھلوں اور سبزیوں کی بُو بازار کے اس حصے پر پھیلی رہتی ہے۔

اس وقت منڈی کی بیشتر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ صرف پنواڑیوں اور حلوائیوں کی دکانیں کھلی تھیں۔ چلموں کی ایک دکان بھی ابھی تک کھلی تھی ایک گھڑی ساز کی بھی، شاید اس لئے کہ وہاں پان بھی فروخت ہوتے تھے۔ دکانوں کے باہر فٹ پاتھ پر دن بھر کے تھکے ماندے سوئے پڑے تھے۔ کئی جگہ دو دو آدمی ایک چارپائی پر سوئے ہوئے تھے ایک

جگہ دو آدمی فٹ پاتھ پر ایک چادر بچھا کر محوِ خواب تھے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جنہیں چارپائی یا چادر دونوں میں سے ایک چیز بھی میسّر نہ تھی۔ ننگے فرش پر ننگے بدن چاندنی کی چادر اوڑھے وہ خواب استراحت کے مزے لے رہے تھے۔ کبھی کبھی ٹریم اس ٹُوٹتے ہوتے سناٹے کو توڑتی ہوتی نکل جاتی تھی۔

ایک جمائیاں لیتے ہوئے پنواڑی کی دکان پر میں رکا۔ اور میں نے اس سے کھاری اور میٹھے سوڈے کی دو چھوٹی بوتلوں کو ملا کر ایک گلاس بنا دینے کو کہا۔

پنواڑی نے گلاس بنا دیا۔ میں نے پانچ چھ آنے، جتنے بھی میرے پاس تھے، اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اور کہا۔ "اپنے پیسے کاٹ کر باقی کے پیسے یا دھیلے دے دو"

پنواڑی کے پاس دھیلے نہیں تھے۔ اُس نے مجھے پیسے دے دیئے۔ گلاس اسے واپس دے کر میں نے انہیں جیب میں ڈالا۔ سلک کی اس ہلکی پھلکی قمیض کی جیب میں ان سولہ سترہ پیسوں کا بوجھ کچھ محسوس سا ہونے لگا۔ گرہن لگنے میں ابھی پون گھنٹہ باقی تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ چلو ذرا پنجابی گلی میں گھوم کے ہو آئیں اور میں چل پڑا۔

کچھ اور آگے جا کر، جہاں بائیں طرف کی چھوٹی دکانوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے میں رُک گیا۔ فٹ پاتھ پر کچھ بھکاری عورتیں گویا ایک دوسرے کو تکیہ بنائے پڑی تھیں۔ کچھ مرد بھی تھے۔ لیکن وہ شاید کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے۔ اور کچھ تماشائی کھڑے تھے۔ چاند گرہن کے متعلق ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک کہہ رہا تھا: "ارے راہو گرس لیتا ہے چاند کو۔"

میں من ہی من میں ہنسا ـــــ راہو خواہ چاند کو گرسے یا نہ گرسے۔ لیکن اس

علمبردار مساوات کے راہوں نے دُنیا کو ضرور گردش رکھا ہے اور انسانیت کے خوبصورت جسم پہ یہ غریب، مفلس اور بھکاری بدصورت پھوڑوں کی طرح ہیں۔

"اسے کون راہو"ـــــ ایک آوارہ نوجوان کہہ رہا تھا۔ جس نے چھٹی ساتویں میں ضرور سائنس پڑھی ہو گی۔ اور جس کی بھوکی آنکھیں اس وقت اس نوجوان بھکارن پہ لگی ہوتی تھیں جو اپنے ریاتے بچے کو دودھ پلا رہی تھی) "یہ تو چاند پہ زمین کا سایہ پڑ جاتا ہے۔"

"لیکن ابھی گرہن لگا نہیں؟" ایک بوڑھی بھکارن بولی۔ جس نے فٹ پاتھ کے نیچے سڑک پہ پاؤں پسار رکھے تھے۔

"ابھی تو دس بجے ہیں۔" نوجوان نے کہا۔

"زیادہ وقت ہو گا!" ایک دوسرا شخص بولا۔

"دس بجکر پانچ منٹ ہوتے ہیں۔ وہ سامنے گھنٹہ گھر کی سوئی نظر نہیں آ رہی!" میں نے مڑ کر دیکھا۔ چاندنی کے باوجود گھنٹہ گھر کی سوئی نظر نہ آ رہی تھی، لیکن اس نوجوان کو ضرور نظر آ رہی ہو گی۔ شاید اس کی نگاہیں زیادہ تیز تھیں۔

"اچھا تو بابو ایک بیڑی ہی پلوا دو۔" سڑک سے پاؤں سکیڑتے ہوئے اس بوڑھی بھکارن نے کہا۔

"پلا دو ایک بیری بابو جی۔" نوجوان بھکارن قریب گڑگڑاتے ہوئے بولی۔ "تمہارا دان ہو گا۔"

"ہم تو خود گرہن کا دان لینے نکلے ہیں۔" نوجوان نے بے حیائی سے کہا۔ اور معنی خیز نگاہوں سے بھکارن کی طرف دیکھا۔ "دلاتے گا ہمیں بھی کوئی دان؟"

اور ایک کھوکھلی سی ہنسی ہنستا ہوا وہ نوجوان بڑھ چلا —— باقی بھی اس کے پیچھے چلے گئے۔

خستہ، بوسیدہ، بے التفاتی کا شکار، گندگی کی بوریوں کی طرح وہ چند بھکارنیں وہاں پڑی تھیں۔ چار پانچ لیٹی ہوئی تھیں۔ ایک کھانس رہی تھی۔ دو تین لڑکیاں مدہوشی کی نیند سوتی ہوئی تھیں۔ ننگی دھرتی پہ پیٹ کے بل ٹانگیں پھیلائے —— اور وہ نوجوان بھکارن تنی سی بیٹھی تھی۔ شاید سوکھی دھرتی پہ لیٹے لیٹے اس کی کمر اکڑ گئی تھی۔ اور وہ اسے سیدھا کر رہی تھی۔ اور اس کا بچہ بدستور ریار ہا تھا۔

مجھے وہاں یوں تنہا کھڑے رہنے میں شرم سی محسوس ہوئی۔ میں چل پڑا۔ اور میں نے اپنے خواب کی نامکمل تصویر کو مکمل بنانے کی کوشش کی۔ من کو پہاڑوں کی خوبصورت وادیوں میں لے چلا —— لیکن آنکھوں کے سامنے بھکاریوں کی وہی ٹولی آنے لگی۔ اور کانوں میں وہی حسرت بھرے الفاظ گونجنے لگے۔ "اچھا تو بابو! ایک بڑی ہی دے دو" اور اگرچہ بھکاریوں کے مختلف مناظر بار بار میرے دماغ میں آکر اسے مکدر بنا چکے تھے اور میں بے طرح اپنی سپنوں کی دنیا میں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں، اپنے خواب کی جگہ بے خیالی ہی میں بھکاری عورت کا خواب دیکھنے لگا۔

وہ کسی وادی یا شہر کے کسی تنہا گوشے میں بنے ہوتے مکلّف بنگلے کا، (جس پر انکسار کے طور پر "غریب نشیمن"، یا "آشیانہ" لکھا ہو) اور اس کی آرام و آسائش کا خواب تو بھلا کیا بنتی۔ اس کا بڑے سے بڑا خواب تو بھرا پیٹ، سر چھپانے کی جگہ، اور بڑی ہوگا۔ اس کا پیٹ ضرور بھر چکا ہوگا۔ ورنہ وہ بڑی مانگنے کی بجائے روٹی مانگتی۔ اور میں نے دیکھا کہ اسوج کی اس دمکتی ہوئی چاندنی میں ٹھنڈے فٹ پاتھ پہ لیٹے ہوئے

اسے روٹی کی یا پناہ کی ضرورت نہیں۔ اس کی سب سے بڑی حسرت تو ایک بیڑی ہے ۔ تو کیوں نہ میں اس کے خواب کی اس تصویر کو مکمل کر دوں؟ میں نے من ہی من میں سوچا لیکن مجھے تو بھکاریوں سے چڑ ہے۔ اور میں نے اس کے خواب کو اور اسے پورا کرنے کی اس خواہش کو پرے ہٹا کر محکم کو آواز دی۔ دو تین آوازیں دینے پر معلوم ہوا کہ وہ اس چاندنی میں سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کی بجائے چپ چاپ آرام سے بستر پر جانے کو چنداں گناہ خیال نہیں کرتا۔

میں مڑا۔ ریل کی چمنی پھر دھواں چھوڑنے لگی تھی۔ اور چاند پھر انبلا سے گزرنے لگا تھا۔ میں ان بھکاریوں کے پاس سے گزرا۔ دور دراز کی مسافت طے کر کے آتے ہوئے تھک ہار کر اس دھرتی ہی کو بستر بنا لینے والے غریب مسافروں کی طرح وہ سب ایک دوسرے سے لگے ہوئے پڑے تھے۔ نوجوان بھکارن ابھی تک بیٹھی تھی اور بڑھیا نے پھر اپنی ٹانگیں سڑک پر پسار لی تھیں ۔ ایک نامعلوم ترغیب کے ماتحت میں نے پوچھا۔

"تم میں سے کسی نے بیڑی مانگی تھی۔"

ایک ساتھ تین چار بھوکی نگاہیں میری طرف اٹھیں ۔ "ہاں" ۔ اور پھر انھوں نے کہا ۔ "اس بڑھیا کو چاہیئے۔ شاید وہ اس بڑھیا کا نام لے کر میری ہمدردی کو بڑھانا چاہتی تھیں۔ ورنہ اس بیڑی کی حسرت مجھے ان سب کی آوازوں میں محسوس ہوئی۔

میں نے کہا "میرے ساتھ آؤ۔ بیڑی کا ایک بنڈل لے دوں۔" اور وہ بڑھیا اٹھی۔ دھوئیں سے چھن کر آتی ہوئی چاند اور بجلی کے قمقموں کی روشنی میں میں نے دیکھا ۔ اس کی عمر زیادہ نہ تھی۔ قد بھی لمبا تھا۔ لیکن وقت، بھوک اور آوارگی نے اس کے چہرے پر بے شمار لکیریں بنا دی تھیں۔ اور اس کے کندھوں کو بھی جھکا دیا تھا۔

اچانک میں نے پوچھا۔ "تم نے کبھی بڑھیا سگریٹ پیا ہے۔"

"ہمیں کبھی عام سگریٹ بھی نصیب نہیں ہوا بابو جی۔ بیڑی بھی ...."

میں نے نپواڑی سے کہا۔ "کریون اے کی ایک ڈبیا اس بڑھیا کو دے دو۔"

"کریون اے تو میرے پاس نہیں ..."

"تو جو بھی بڑھیا سگریٹ کی ڈبیا تمہارے پاس ہے، اسے دے دو۔"

ڈبیا لے کر بڑھیا نے دعا دی۔ میں نے کہا۔ "دیکھو ایک ایک سگریٹ سب کو بانٹ دینا اور دیکھنا اس ڈبیا کو بیچ نہ دینا۔ میں دیکھ رہا ہوں۔"

"جی نہیں" ـــــ اور بڑھیا چلی گئی۔

میرے جی میں آئی کہ میں جا کر ان سب کو سگریٹ پیتے دیکھوں۔ اور ان سے خصوصاً اس نوجوان عورت سے باتیں کروں۔ لیکن مجھے کچھ عجیب شرم سی محسوس ہوتی اور میں چلا آیا۔ گھر آ کر میں نے کہا کہ پیسے نہیں ملے اور نوکر کو روپیہ دے کر پھر بازار بھیج دیا۔

اس رات جب میں سویا تو بھکارن کا مکمل خواب میرے سامنے دوڑ گیا۔ بھرا پیٹ سر چھپانے کی جگہ اور ایک بیڑی ـــــ اور پھر آہستہ آہستہ اس خواب پر میرا اپنا خواب چھاتا گیا۔ تین لاکھ کا، کبھی نہ پورا ہونے والا خواب!

یہ عجیب بات ہے کہ اس رات پہاڑ کی خوبصورت وادی میں مَیں نے جو نشیمن بنایا اس میں میرے ساتھ محبت کرنے والی حسین بھولی بھالی لڑکی کی شکل کچھ اس نوجوان بھکارن سے ملتی جلتی تھی

ناسُور

سرجیت نے جلدی جلدی لکھا۔ ——

"ایشور جی مجھے لے چلو۔ اسی وقت لے چلو، میری روح قفس کی تیلیوں میں ہمیشہ کے لئے بند ہو جانے والے پنچھی کی طرح چھٹپٹاتی رہے گی۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں تل تل کر کے جلتی رہوں؟ آپ نے مجھے یہ سب کیوں سکھایا؟ —— یہ آرٹ یہ فن، یہ جدت، یہ ندرت —— میری آنکھوں کو اتنی وسعت اور باریکی کیوں عطا کی؟ میرے دل کو اتنا حسّاس کیوں بنا دیا؟ میرے دماغ کو... کیا اس لئے کہ ان تمام جذبات و احساسات کے ساتھ، ان اپنی لمبی لمبی اُنگلیوں سے، (جو آپ کے قول کے مطابق، خاص طور پر تصویر کشی کے لئے بنی ہیں) میں لوہے کی سلاخوں پہ رنگ کیا کروں..."

اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ آنسوؤں کے ایک دو قطرے کاغذ پر گر کر پھیل گئے

حلق میں کچھ گولا سا آکر اٹک گیا۔ اور دل کی کپکپی سے کلائیوں کی چوڑیاں قدرے جھنجھنا اٹھیں اور پیشانی کے سنہری چاند کا عکس سامنے سنگار کی میز کے آئینہ میں پڑ کر کمرے کو منور کرتا ہوا فضا میں کھو گیا ــــ

قریب ہی رسوئی خانے سے گویا بے شمار پلیٹوں کے دھوتے اور رکھے جانے کی آواز آرہی تھی، لذیذ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو ماحول کے ذرّے ذرّے میں بسی جارہی تھی نوکروں اور منتظموں کی چل پوں کے مارے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پرے ہال کمرے میں، براتی کے بیٹھنے کا انتظام کرنے والے لوگوں میں الیشور کا کوئی قہقہہ گیلری میں سے ہوتا ہوا دہار، آپہنچتا تھا اور اوپر برساتی میں بچیاں گا رہی تھیں۔ بالو اپنے چاند سے کہتی ہے :ــ

کوئی مصری دی ڈلی اوڈلی
کل اساں ٹر جانا۔ پھر ڈھونڈیں گا گلی اوگلی

سرجیت جھکی جھکی نکھر رہی تھی۔ خوبصورت بنارسی ساڑھی اور بیش قیمت زیوروں میں ملبوس اس کے حسن کو چار چاند لگے ہوتے تھے۔ لیکن یہ چاند موسم سرما کی چاندنی راتوں کے وہ چاند تھے۔ جن کی ضیا صبح کے دھندلکے میں ماند پڑ چکی ہو۔

سیدھی کھڑی ہو کر، ساڑھی کے دامن سے آنکھوں کو پونچھتے ہوتے اس نے خط پڑھا ہال کمرے سے الیشور کا قہقہہ پھر گیلری میں سے گزرتا ہوا آیا ــــ

خط کو فوراً بند کر کے اس نے نوکر کو آواز دی۔

رسوئی کے دروازہ پر اس کے بابا کھڑے تھے۔ ان کے چہرے کی رگ رگ سے مسرّت پھوٹ رہی تھی ــــ ان کی زندگی میں، جیسے اس سے بڑا خوشی کا دن

پھر نہ آئے گا۔ ان کے گال پھولے ہوتے تھے۔ آنکھیں روشن تھیں اور ڈاڑھی کے سفید بال گویا اندرونی مسرت کے عکس سے چمک رہے تھے۔

سرجیت کرسی میں دھنس گئی۔ خط اس کے ہاتھوں میں تڑ مڑ گیا۔ اور پھر پُرزے پُرزے ہو گیا۔

اسی وقت نوکر نے آکر پوچھا۔ "کہئے بی بی جی؟"

"الیشور جی سے کہو۔ اتنے اُونچے نہ ہنسیں۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے" نوکر لمحہ بھر کے لئے حیران کھڑا رہا۔ اور پھر چلا گیا۔

اور سرجیت نے سوچا آج یہ اتنے زور سے اور اتنا زیادہ کیوں ہنس رہے ہیں۔ پہلے تو کبھی اس طرح نہیں ہنسے۔

پانچ مہینے پہلے۔

آغازِ بہار کی ایک دوپہر میں ایک دُبلا پتلا خوبصورت نوجوان ۵۲ کناٹ سرکس کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ گلے میں سلک کی قمیض، اس پر اچکن۔ کمر میں چوڑی دار پائجامہ، پاؤں میں کامدار جوتا اور سر پر احتیاط سے سجائی ہوئی دستار! اس کا رنگ گندمی تھا۔ لیکن طور اطوار اور پوشش سے وہ ہنس مکھ حسین صورت نوجوان معلوم ہوتا تھا اور بے پروائی کا بھی کوئی نشان اس میں دکھائی نہ دیتا تھا۔ اچکن کے بٹن ضرور کھلے تھے۔ قمیض کے گلے کا بٹن بھی کھلا تھا۔ اور گلے کا خوبصورت خم صاف دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اتنی سی بے پروائی تو فیشن میں شامل سمجھ کر نظر انداز کی جا سکتی ہے۔

سیڑھیوں کے پاس آکر وہ کچھ رُکا۔ باہر دھوپ تیز تھی اور اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں جھلک آئی تھیں جیب سے ایک دودھ جیسا سفید تہ کیا ہوا رومال نکال کر اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ سُکھ کی ایک لمبی سانس لی اور پھر ان کشادہ سیڑھیوں کی دیوار پر اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے غیر ارادی طور پر نظر نہ آنے والی تصویریں بناتا ہوا آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔

چند لمحے بعد وہ جس کمرے میں داخل ہوا وہ ایک آرٹسٹ کا کمرہ تھا۔ یوں اسے ڈرائنگ روم بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کمرے کی اہم چیزیں، قیمتی کوچ، ان پر پڑے ہوئے ریشمی گدے، صاف دشفاف دری، اس پر خوبصورت غالیچے۔ درمیان میں رکھا ہوا اخروٹ کی لکڑی کا چوکور میز، اس پر گلدان، کھڑکیوں یا دروازوں کے بھاری پردے نہ تھے، بلکہ دیواروں پر ٹنگے ہوئے مصوری کے بہترین نمونے، انگیٹھی کے کپڑے کی گلکاری اس پر رکھی ہوئی ایک پیتل کی بڑی اور خوبصورت مورتی ایک کونے میں رکھا ہوا اینل، اس پر فٹ کیا ہوا سکرین، پاس ہی کے سٹول پر پڑی ٹرے اور اس میں احتیاط سے سجا ہوا پلیٹ، رنگ کا ڈبہ اور قیمتی برش تھے۔

کمرے میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ نوجوان نے نہایت میٹھی آواز میں پکارا ——

"مسز جیت!"

پھر دروازے پر پیار بھری ٹک ٹک اور کواڑ کھول کر وہ پائدان پر پاؤں پونچھتا ہوا اندر داخل ہوا۔

لمحہ بھر کے لئے اس نے ادھر ادھر ٹنگی ہوئی تصاویر پر ایک نگاہ ڈالی، پھر وہ سکرین کے پاس گیا۔ چارکول کا کچھ سکیچ سا بنا ہوا تھا۔ اس نے ٹرے میں چارکول اٹھا

کو ایک دو لکیریں بناتے ہوئے پھر آواز دی۔ "سرجیت!"

ایک چھوٹے سے نوکر نے اندر سے کہا — "ابھی آتی ہیں بابوجی" اور ایک پلیٹ میں مٹھائی لا کر میز پر رکھ دی اور پوچھا "سوڈا پئیں گے یا...

"پانی۔" اور پھر اس نے کہا... "نہیں کچھ بھی نہیں..."

نوکر چلا گیا۔

نوجوان نے مٹھائی کا ایک ننھا سا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا۔ اور وہ برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔ باہر ٹھنڈی ہوا رینگ رہی تھی۔ سامنے فٹ پاتھ پر نوعمر جامن کے درخت مستی میں جھوم رہے تھے۔ تارکول کی وسیع، چوڑی سڑک پر ایک تانگہ جا رہا تھا۔ اس میں کوئی جوبن ماتی گویا اپنی ہی دنیا میں مست بیٹھی تھی۔ نیچے دکان کے سامنے ایک موٹر رکی اور اس میں سے اتر کر ہاتھ میں بٹوا لئے ایک تیز تیز چلتی ہوئی ساڑھی دوکان میں داخل ہو گئی۔ اس کے پیچھے ایک سوٹ سگار کا دھواں چھوڑتا ہوا نکلا۔ پاس سے سرخ گالوں والے دو بچے لمبے لمبے کالروں کی قمیصیں اور نیلی نکریں پہنے سائیکلوں پر جیسے اڑتے ہوئے چلے گئے...

نوجوان نے ایک لمبی سانس لی۔ وہ مڑا، اندر سے پاؤں کی چاپ سنائی دی اور تصویر کا فریم دکھائی دیا۔

"زندگی بھی کیا دل کا عکس نہیں سرجیت؟..." اس نے فلسفیانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

لیکن جسے وہ سرجیت سمجھتا تھا وہ سرجیت کے بابا نکلے۔ تصویر ہاتھوں میں لئے اور اسے دیکھتے ہوئے وہ آ رہے تھے۔ دہلیز کی ٹھوکر لگنے سے گرتے گرتے

نیچے۔ ان کے گالوں سے خوشی جھلکتی تھی۔ ان کی آنکھوں سے مسرت کی کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔

نوجوان نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ سفید ڈاڑھی، بھولا چہرہ، مسکراتے ہوئے ہونٹ سردار بہادر سردار گوردیال سنگھ دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے پدرانہ عقیدت مندی جھلک آتی تھی۔

"سرجیت آج نہ آئے گی؟" اس نے پوچھا۔

بزرگ ذرا نزدیک آئے اور رازدارانہ انداز سے بولے۔ "امرتسر میں ٹاٹا کے ایجنٹ ہیں نا سردار صاحب سردار بلبیر سنگھ اور ان کے لڑکے ہیں مہندر سنگھ۔۔ ایم۔اے ہیں اور تعلیم حاصل کر کے سری نگر میں اپنی برانچ کے کام کی نگرانی کرتے ہیں ——— وہ آج سرجیت کو دیکھنے آئیں گے۔ ان کی دو کوٹھیاں امرتسر میں ہیں اور لاہور میں اور کشمیر میں۔۔۔" اور انھوں نے پوچھا۔ "دیکھو اس تصویر کو تم نے سرجیت کی سب سے اچھی تصویر کہا تھا۔ اور اس کی تعریف بڑے بڑے آرٹسٹوں نے بھی کی ہے۔ اسے اس جگہ کیوں نہ لٹکا دیا جائے؟"

طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ نوجوان نے پوچھا۔ "تو وہ بھی آرٹسٹ ہیں ——؟"

بابا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "نہیں۔۔۔ مگر۔۔۔

"ہاں! ہاں لگا دیجئے۔ اور ابنیدر ناتھ، نند لال بوس، کنوڈلیائی اور چغتائی کی تصویروں کی جگہ بھی سرجیت کی بنائی ہوئی دھارمک تصویریں لگا دیجئے۔ شاید وہ یہ سب تصویریں پسند نہ کریں۔ آپ کو یاد ہے نا، چمن سنگھ۔۔۔"

"ٹھیک ٹھیک" اور بزرگ جلدی جلدی واپس لوٹ گئے۔ پھر ابنیدر ناتھ کے

"آزاد ہرن" کی جگہ اپنے دھیان میں محو گورو نگ، نندلال بوس کے "پرکرتی پرش" کی جگہ دربار صاحب امرتسر چغتائی کے "پروانے" کی جگہ گوردیتیغ بہادر، اور کنوڈ لیسائی کے "باپو" کی جگہ سرجیت کی خود اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی اپنی تصویر لگادی گئی۔

جب کمرہ مختلف آرٹسٹوں کی نمائش کی جگہ ایک ہی آرٹسٹ کی دھارمک تصویروں کی نمائش گاہ بن گیا۔ اور وہ تصویریں، جن پر ہندوستان کے شہرۂ آفاق مصوّروں نے نہ جانے کتنے قیمتی دن صرف کئے تھے، اور جنہیں سرجیت نے نہ معلوم کس ذوق شوق سے لاہور، شملے، دلی اور کلکتے کی نمائشوں سے خرید کیا تھا۔ اندر کے چھوٹے سے سٹور روم میں چلی گئیں ـــــ (جو صرف سرجیت کے مصوّری کے سامان کے لئے مخصوص تھا) ....

تب بزرگ ایک اطمینان کی سانس لے کر برآمدے میں جا بیٹھے۔ اور نوجوان کوچ میں دھنس گیا۔ لیکن دھنسنے سے پہلے اس نے اتنا ضرور پوچھا۔ "تو آج میں جاؤں؟" اور جب "نہیں نہیں ... آپ ..." کہتے ہوئے بزرگ اٹھنے لگے تھے تو وہ چپ چاپ بیٹھ گیا تھا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھیں سرجیت کی تصویر پر چلی گئیں ـــــ سرجیت کی اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی اپنی تصویر ... کوئی دیکھ لے تو دیکھتا ہی رہ جائے حسن کی صبح اپنی تابانی کے ساتھ طلوع ہو رہی تھی۔ آنکھوں کو طراوت اور روح کو بالیدگی بخشنے والا نور چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ اور دل و دماغ اس کی ضو سے روشن ہوتے جاتے تھے۔

سرجیت کی اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی اپنی تصویر ... لیکن وہ جانتا تھا کہ اس نے اس تصویر پر کتنی محنت کی تھی اور اس کے دماغ کی تمام طاقتوں نے کس طرح اس کے نقوش کو ابھارا تھا۔ کیا اس لئے کہ ایک لوہے کا سوداگر اسے دیکھ کر سرجیت کو

پسند کر سکے ؟

ایک طنز بھری مُسکان اس کے ہونٹوں پہ پھیل گئی۔ اس کا دم گھٹنے سا لگا لیکن اس وقت سرجیت کمرے میں داخل ہوتی پنکھڑیوں سے ہونٹ مسکرائے۔ شرم کے بار سے دبی تتلی کے پنکھوں سی پلکیں پھڑپھڑائیں اور ہاتھ جوڑتے ہوئے گویا ہونٹوں ہی میں اس نے کہا۔ "ست سری اکال ایشور جی !"

"ایشور ہے —— نوجوان من ہی من میں ہنسا اور پھر جیسے میلوں کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ کوچ میں دھنسا ہوا ہو اور اسے اٹھنے میں تکلیف ہو رہی ہو —— بیدلی سے اپنی ہتھیلی کوچ پر رکھ کر وہ اٹھا، اور ایزل کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ دو دن آئے نہیں ؟"

اور وہ تتلی کے پنکھ پھڑپھڑائے۔ نوجوان نے ادھر دیکھا اور مسکرایا ——

سرجیت بولی :۔

"میری یہ تصویر دیکھئے گا، سب تصویروں سے بازی لے جائے گی۔ میں کہتی ہوں ایشور جی میرے دل میں اتنے جذبات ہیں، اتنے خیالات ہیں کہ اگر مجھے ٹکنیک پر قدرت حاصل ہو جاتی تو نہ جانے کیسی کیسی چیزوں کی تخلیق کر دوں۔" "ایک نور تے سب جگ اپجیا"، تک آپ نے سنی ہوگی۔ لیکن اس کی معیاری تشریح —— کا خاکہ بھی ذرا دیکھئے

"لیکن لوہے کا سوداگر شاید اسے پسند نہ کر سکے۔" کوئلے کو خاکے کی کچھ لکیریں کو ابھارتے ہوئے ایشور نے کہا۔

سرجیت کا رنگ کانوں تک سرخ ہو گیا اور اس نے گویا پہلی بار چونکی ہوئی ہرنی

کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔

"یہ کیا؟ یہ سب تبدیلی کس نے کی؟" اپنی تصویر کو دیکھتے ہوتے سرجیت نے کہا

"اس لئے کہ تو ہے کا سوداگر تمہیں پسند کر لے، جانتی ہو نہ، چرن سنگھ کی بات....."

یہ چرن سنگھ ایک پروبشیزی مجسٹریٹ تھے۔ بہت غریب گھرانے میں پیدا ہوتے تھے۔ اپنی محنت کی بدولت پی۔سی۔ایس کے امتحان میں اوّل آتے تھے۔ ایک تصویر کی نسبتاً عریانی دیکھ کر انہوں نے کہا تھا "جو ایسی تصویریں بنا سکتی ہے (یا شاید یہ کہا تھا کہ جو ایسی تصویریں ڈرائنگ روم میں لگا سکتی ہے) وہ ایک گھر سکھی نہیں رکھ سکتی بھیر وہ خوبصورتی ہیں چاہے حور ہی کیوں نہ ہو —" ان کی یہ بات ایک دوست کے ذریعے الیشورننگ پہنچی تھی اگرچہ اس وقت تو انہوں نے صرف یہی کہا تھا کہ لڑکی زیادہ تعلیم یافتہ ہے اور انہیں اتنی پڑھی لکھی رفیقہ نہیں چاہیئے۔

پانچ سال پہلے:

الیشور اپنے سٹوڈیو میں صرف ایک ریشمی قمیص اور تہمد پہنے اور برش ہاتھ میں لئے ایک تصویر میں رنگ بھر رہا تھا۔ چونکہ تصویر حسب خواہش بن رہی تھی اس لئے وہ دھیمے سُر میں سیٹی بھی بجاتے جاتا تھا۔ اس نے تصویر کا نام رکھا تھا۔ "ادھورا گیت"

کسی شام کے دھندلکے میں جب مغرب کے افق پہ گہرے نیلے بادلوں میں ندیوں کی مانند لال لال لکیریں جھلملا اٹھتی ہیں۔ زندگی کی شاہراہ پر ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ آملتے ہیں — کچھ دیر اکٹھے چلتے ہیں۔ دلوں کے ساز سے محبت کا نغمہ نکلتا ہے۔ لیکن

ابھی وہ گیت ختم نہیں ہوتا کہ زندگی کی شاہراہ کا موڑ آجاتا ہے۔ جہاں سے انہیں جدا ہونا ہے... تبھی نوکر نے کارڈ دیتے ہوتے کہا۔ "سردار بہادر سردار گوردیال سنگھ۔"

اس نے کارڈ وہیں رکھ دیا۔ اور وہ ڈریسنگ گاؤن پہن کر نو وارد سے ملنے کے لئے تیار ہو گیا۔

نو وارد سادہ لوح بزرگ تھے۔ گھنی لمبی سفید ڈاڑھی اور بھاری مونچھوں میں سے ہونٹوں کی مسکراہٹ چھن چھن کر چہرے کو منور کر رہی تھی۔

"میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔" انہوں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کے فن کی بہت تعریف سنی ہے۔ میری ایک پوتی ہے اور صرف وہی میری مسرتوں کا مرکز ہے۔ میرا لڑکا انجنیئر تھا۔ وہ اور اس کی بیوی بچے سب کوئٹے کے زلزلے میں دب گئے۔" اور اس واقعہ کی یاد ہی سے ان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آتے۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوتے انہوں نے کہا... "بس ایک یہ لڑکی بچ گئی۔ باپ نے اسے ترس ترس کر حاصل کیا تھا۔ اس کے جنم پر باجے بجاتے تھے۔ شیرینی تقسیم کی تھی۔ لیکن اپنی زندگی میں وہ اسے اپنے گھر خوش وخرم دیکھنے کا شوق بھی پورا نہ کر سکا۔"

اور خشک گلے کو زبردستی گیلا کرتے ہوتے انہوں نے پھر کہا۔ "ایف۔ اے میں اپنی جماعت میں اچھے نمبروں پر پاس ہوتی تھی۔ اسے تصویریں بنانے کا بڑا شوق ہے۔ اگر آپ کچھ وقت دے سکتے تو ــــ"

الیشور نے بڑی حلیمی سے کہا۔ "میں جی ٹیوشن نہیں کرتا۔"

بزرگ کچھ مایوس ہو گئے۔ تاہم انہوں نے کہا۔ "یہ میری زبردست خواہش تھی کہ آپ کچھ نہ کچھ وقت خواہ ہفتے میں صرف ایک بار ہی کیوں نہ ہو، اسے ضرور دیتے۔"

اور پھر کہا۔ ''وہ اسے بہت شوق ہے۔ اس کا ہاتھ بھی کافی چلتا ہے۔ آپ کو زیادہ تکلیف نہ کرنا پڑے گی صرف اسے راستہ دکھانے کی ضرورت ہے اور وہ چل پڑے گی ---''

بزرگ کی صورت میں کچھ ایسی عاجزی، ان کے لہجے میں کچھ ایسی انکساری اور استدعا تھی کہ مصور کا دل تذبذب میں پڑ گیا۔

اور بوڑھے سردار بہادر نے پھر کہا تھا۔ ''پتا کی وہ بہت لاڈلی تھی۔ اب جب کہ اس کے سر سے پتا کا ہاتھ اٹھ گیا ہے میں اسے یہ کمی محسوس نہ ہونے دوں گا۔ میں اس کی ہر خواہش پوری کروں گا۔''

---- یہ کہتے کہتے ان کی آواز بھاری ہو گئی تھی اور مصور مان گیا تھا۔

دو دن بعد جب وہ بتائے وقت پر ان کے گھر پہنچا تھا اور دری پہ بیٹھی ہوئی اور ایک کاغذ پہ کسی چیز کا خاکہ بناتی ہوئی ایک دوشیزہ سے بزرگ نے کہا تھا۔ ''سرجیت یہ ہیں تیرے ماسٹر جی''، اور جھکی جھکی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے اوپر اٹھی تھیں تو وہ مسحور رہ گیا تھا۔

پھر وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس نے ہفتہ میں صرف ایک بار آنے کا وعدہ کیا تھا۔

لیکن یہ سب تو پہلے کی باتیں ہیں۔ اس دن تو صرف اتنا ہی ہوا کہ سٹوڈیو میں پڑے ہوتے ایزل اور اس پہ کسے ہوتے سکرین اور اس پہ پایۂ تکمیل تک پہنچنے کی منتظر تصویر کو بھول کر وہ بیاہ کے لئے کرایہ پر لی ہوئی اس کوٹھی میں سرجیت کے بابا کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ اور نوکروں حلوائیوں اور دور دراز سے شادی کے موقع پہ آنے والے مردوں، عورتوں، اور ان کے بچے بچیوں کے شور و شغب میں اس کے قہقہے گونجتے رہے

اور جب وقت آنے پر دولہا صاحب تشریف لاتے، گیانی جی نے شبد پڑھنے شروع کئے تو سرجیت چپ چاپ گرنتھ صاحب کے سامنے جابیٹھی۔

اس کے بعد ایک برس تک سری نگر سے اس کے خط آتے رہے۔ ایک خط میں اس نے لکھا:

"..... ہر طرف بہار چھائی ہے، پھول کھلے ہیں۔ مگو گوشوں کے درخت پھلوں سے لد گئے ہیں۔ لیکن میرے من کا پھول مرجھا گیا ہے اور پھل شاید اب اسے کبھی نہ لگے ....."

پھر ایک چٹھی میں لکھا:

"... یاد ہے نا الیشور جی، تم نے ایک بار کہا تھا۔ میں تمہارے یہاں کبھی ٹیوشن نہ کرتا اگر یہ کہتے کہتے ——— پتا کو وہ بہت لاڈلی تھی، اب جبکہ اس کے سر پر پتا کا سایہ نہیں رہا، ہیں اسے یہ کمی محسوس نہ ہونے دوں گا۔ میں اس کی ہر خواہش پوری کروں گا ——— تمہارے بابا کی آنکھوں میں آنسو نہ آجاتے۔ مجھے تمہارے منہ سے سنے ہوئے ان کے یہ فقرے بار بار یاد آتے ہیں۔ انھوں نے میری تمام آرزوئیں پوری کی ہیں یا میں نے ان کی؟"

پھر ایک بار لکھا:۔

"الیشور جی، ماں باپ لڑکیوں کو سولاڈ پیار سے پالتے ہیں۔ انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلاتے ہیں۔ انہیں فنونِ لطیفہ سے روشناس کرتے ہیں۔ کوئی موسیقی میں کمال حاصل کرتی ہے۔ کوئی شاعرہ بن جاتی ہے اور کوئی بدنصیب آرٹسٹ! پھر ماں باپ

بیاہ کر دیتے ہیں۔ میری ایک سہیلی ہے۔ اس کی آواز میں غضب کا لوچ تھا۔ لیکن اب اس کے سازوں پر دھول پڑی رہتی ہے۔ اور ان کے ڈھکنے تک کھولنے میں بھی اسے کوفت ہوتی ہے۔ ایک دوسری سہیلی اچھی شاعرہ اور افسانہ نگار بن رہی تھی۔ اس کے پتا اسے دیکھنے کے لئے آنے والوں کو بڑے فخر کے ساتھ اس کی لکھی ہوئی نظمیں اور کہانیاں دکھایا کرتے تھے۔ لیکن اب —— اسے اخبار تک دیکھے ہفتوں گزر جاتے ہیں۔ ایک تیسری تھی۔ سرجیت۔ بڑی مصور بننے جا رہی تھی لیکن اب ——

پر چھوڑو۔ باہر صبح کا سورج کب سے نکل آیا ہے کھڑکی کے شیشوں سے میں پہاڑ کی برفانی چوٹیوں کو دھوپ میں دمکتے ہوئے دیکھ رہی ہوں۔ باہر جا کر پہاڑیوں میں سے سورج کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھنے کے لئے روح تڑپ رہی ہے۔ لیکن وہ تو پڑے خراٹے لے رہے ہیں اور دس بجے تک لیٹے رہیں گے۔

یہ خط! کبھی پندرہ دن، کبھی مہینہ اور کبھی دو مہینے کے بعد آتے رہے۔ لیکن آخر ان کا سلسلہ قطعی بند ہو گیا۔

پانچ سال بعد ——

آغازِ بہار کی ایک دوپہر تھی۔ الیشور ۵۰ ہم کناٹ سرکس کی طرف جلدی جلدی قدم بڑھاتے جا رہا تھا۔ سر پہ دستار ہی تھی۔ لیکن ہم اسے احتیاط سے سجائی ہوئی نہیں کہہ سکتے۔ گلے میں سلک کی قمیض اور اس پر اچکن تھا۔ لیکن دونوں کا رنگ ذرا میلا تھا۔ اوپر کی جیب کا رومال اب دائیں جیب میں پڑا تھا اور اب وہ تہ کیا ہوا بھی نہ تھا اور نہ ہی وہ دودھ جیسا سفید تھا۔ کمر میں چوڑی دار پاجامہ تھا اور پاؤں میں

پچل۔ کچھ ایسی بے پروائی اس پر مسلّط تھی جسے فیشن میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

آسمان پر سفید، مٹیالے نیلے۔ کالے بادلوں کے ٹکڑے بکھرے ہوتے تھے۔ جیسے آسمان کے اس وسیع سکرین پر کسی مصوّر نے اپنے قلم سے کہیں ہلکے اور کہیں گہرے دھبے بنا دیئے ہوں۔ سورج پر ایک کالے بادل کا ٹکڑا چھا گیا تھا اور دور کوٹھیوں پر دھوپ چمک رہی تھی۔

وہ ایک لمحہ کے لئے رکا پیشانی پر پسینہ کے قطرے نہ تھے اور اگر ہوتے بھی تو وہ انہیں پونچھنے کا تردد نہ کرتا۔ آج پانچ برس کے بعد سرجیت آئی تھی۔ اپنے بابا کی موت پر ہی۔ اور اس نے سنا تھا کہ اس پانچ برس کے عرصے میں وہ تین بچوں کی ماں بن چکی ہے کچھ دیر بعد جس کمرے میں وہ داخل ہوا وہ ایسا ہی تھا۔ جیسے کوئی ایسا کمرہ پانچ سال کے بعد ہو سکتا ہے۔ جسے اس لمبے عرصے میں ایک دفعہ بھی عورت کے ہاتھوں نے نہ چھوا ہو۔ وہی پردے تھے۔ وہی کوچ۔ وہی میز وہی اس پر رکھے ہوئے گلدان۔ وہی انگیٹھی اور اس پر وہی مورتی اور وہی تصویریں جن کو اس غرض سے لگایا گیا تھا۔ کہ لوہے کا سوداگر ان کی خالق کو پسند کرے۔ سب کچھ وہی تھا۔ صرف ایک ہلکی سی اداسی ان پر چھائی ہوئی تھی ـــــ کم از کم جب الیشور کمرے میں داخل ہوا تو اس نے ایسا ہی محسوس کیا۔

آنے سے پہلے اس نے آواز دی۔ لیکن سرجیت کا نام لے کر نہیں۔ نوکر کا نام لیکر پھر دروازے پر بیدلی سے ٹک ٹک بھی کی لیکن اس کے نہ کھلنے پر وہ اندر نہیں گیا بلکہ باہر انتظار کرتا رہا۔

تب ایک ننھی بچی نے آکر کہا۔ "آجایئے"

——اور وہ کوچ پر جا کر بیٹھ گیا اور حسرت سے اسی ننھی سی کلی کی طرف دیکھنے لگا۔ ماں جیسا چھریرہ پتلا جسم۔ لمبی تیکھی ناک۔ خوبصورت دل کش چہرہ۔ ویسی ہی پھڑ پھڑاتی پلکیں اور پتیوں سے ہونٹ۔ ہاتھ پکڑ کر اس نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور بولا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"لاڈلی"

"لاڈلی" اس نے دل میں سوچا۔ شاید تمہارے ہی آنے پر سرجیت نے خط لکھنا بند کر دیا تھا۔ لیکن بظاہر اس نے اسے گود میں بھینچ لیا اور حسرت آمیز آنکھوں سے اس کے منہ کو تکنے لگا۔ پھر اس نے اسے چوم لیا——

اس وقت سرجیت ایک بچے کو گود میں لئے ہوئے داخل ہوئی۔ ایشور کے چہرے پر سیاہی سی پت گئی۔ جیسے اسے کسی نے گناہ کرتے پکڑ لیا ہو——اور سرجیت کے بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ ایسی جھرجھری کہ پانچ برس کے عرصے میں تین بچوں کی ماں بننے پر بھی نہ دوڑی تھی۔

وہ ایک طرف کوچ میں بیٹھ گئی۔ ایشور سب کچھ بھول گیا۔ سرجیت اتنی موٹی نظر آتی تھی کہ وہ حیران تھا کہ یہ وہی سرجیت ہے یا کوئی اور۔ آخر اس نے کہا "آپ تو کشمیر جا کر خوب تندرست ہو گئیں۔"

سرجیت کے ہونٹوں پر ایک درد بھری مسکان پھیل گئی "ایسے ناسور کیا آپ نے نہیں دیکھے جو باہر سے اچھے نظر آتے ہیں۔ لیکن اندر ہی اندر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔"

اس نے لمبا سا سانس بھر کر کہا۔ لمحہ بھر تک ایشور ہکا بکا سا بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سرجیت کے بابا اور ان کی وفات کی بات چیت چھیڑ دی۔

——ایک گھنٹہ بعد جب وہ پھر سیڑھیوں کی دیواروں پر لکیریں سی بناتا ہوا نیچے اتر رہا تھا تو دل ہی دل کہہ رہا تھا۔" ایسے ناسور بھی تو ہوتے ہیں جو اندر باہر دونوں طرف بڑھتے ہیں۔ سمرجیت شاید انہیں نہیں جانتی۔

کاکڑاں کا تیلی

"اڑھائی روپے" مولُو نے طنز سے سر ہلا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ان نگاہوں سے جو گویا کہہ رہی تھیں کہ کمبخت تانگے والے کی عقل شاید ٹھکانے نہیں رہی۔

ابھی مشکل سے ساڑھے آٹھ کا وقت ہو گا، لیکن دن پہاڑ سا نکل آیا تھا سورج عین سر پر معلوم ہوتا تھا۔ گرمی اتنی تھی کہ دم گھٹا جاتا تا۔ گرد کی ہلکی سی دھند چاروں طرف چھائی ہوئی تھی اور اس وجہ سے شعاعیں اگرچہ سیدھی نہ پڑتی تھیں، تو بھی جسم کے برہنہ حصوں میں نوکیں سی چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

مولو نے اپنی بڑی سی پگڑی کو ٹھیک کیا — جسے اس کی بیوی نے رات ریٹھوں کے پانی سے دھویا تھا اور چاولوں کی کنی کو پکا کر کلف دیا تھا اور جسے رحماں اور لہراں اس کی دونوں بیٹیوں نے دونوں طرف سے پکڑ کر آنگن میں چھڑ لگا کر سکھایا تھا — پھر

اس نے اپنی لمبی سفید ڈاڑھی پر جو ہونٹوں کے پاس پیلی ہو گئی تھی۔ ہاتھ پھیرا، گٹھڑی کو بائیں کندھے پر کر کے دائیں ہاتھ سے تہمد کو ذرا سا جھٹکا دیا اور چل پڑا۔

"میاں،" اس کی بیوی نے سامنے جاتے ہوئے تانگے کے پیچھے اڑتی ہوئی دھول میں آنکھیں جما دیں۔ اور بولی۔ "ڈھائی روپے، اس سے تو پندرہ دن تک گھر کا گزارہ چل سکتا ہے، کچھ نہیں تو رحماں اور رہراں کے دوپٹے آسکتے ہیں، یا پھر میرے ننھے چراغ کی خیذ کو تیاں بن سکتی ہیں۔"

اور اس نے گود میں لئے ہوئے ابلی ابلی، سوجی سوجی، آنکھوں والے اپنے کالے سیاہ لڑکے کو محبت سے چوم لیا۔

جوتے کے ساتھ گرد اڑ کر مولو کے تہمد پر پڑ رہی تھی۔ رات اس کی بیوی نے اس کے کپڑوں کو دھویا اور نیل دیا تھا —— جو شاید رات کی تاریکی میں زیادہ دیا گیا تھا۔ کیونکہ تہمد کی سفیدی میں ہلکی سی نیلاہٹ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اور جوں جوں گرد پڑتی تھی اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔

مولو نے پھر ایک بار تہمد کو جھٹکا دے کر اسے ذرا اوپر اٹھا کر ٹھونس لیا۔ "ان سالے تانگے والوں نے سڑک کا ستیاناس کر دیا ہے، مٹی میدہ بن گئی ہے" وہ بولا اور اس نے بیوی سے اور اس کے پیچھے چلی آنے والی دونوں لڑکیوں اور سات آٹھ سال کے بچے سے کہا کہ وہ سب سڑک چھوڑ کر مینڈھ مینڈھ ہو کر چلیں۔

لیکن وہاں تو صرف تانگے ہی چلتے تھے۔ جب مولو تین چار میل چل کر بھیلووال کے پاس پہنچا۔ جہاں ایک لاری بھی چلتی تھی۔ اور بکریوں اور بھیڑوں کا ایک ریوڑ بڑھ رہا

بَیں، بھَیں بھَیں، کرتا ہوا قصبہ سے نکلا۔ اور رات بھر باڑے میں بند رہنے کے بعد چنچل اور شوخ بکریاں (جو ابھی مائیں نہ بنی تھیں اور جن کے تھن اتنے بھاری نہ تھے کہ ان کے نیچے تھیلی لگانے کی ضرورت پڑے) اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے نا آشنا میمنے قلانچیں بھرنے لگے تو مولو کو اس میدے کی حقیقت کا احساس ہوا۔ گرد اس طرح اٹھی کہ اس کے لئے آنکھ کھولنا اور مڑ کر اپنے بیوی بچوں کو دیکھنا مشکل ہو گیا۔

جب طوفان کچھ تھما اور بکریوں اور بھیڑوں کی آوازوں کو دباتی ہوئی، چرواہوں کی فحش گالیوں کی کرخت آوازیں حدِ سماعت سے پرے چلی گئیں تو مولو سڑک کو پار کر کے، دوسری طرف گیہوں کے کٹے ہوئے کھیت میں جا کر کھڑا ہوا۔ گٹھڑی اس نے اتار کر زمین پر رکھ دی، اور تہمد اور قمیض کو اچھی طرح جھٹک کر اس نے سر سے پگڑی اتاری اور اسے اچھی طرح جھاڑا قمیض کے دامن کو الٹا کر کے اس سے منہ پونچھا۔ پھر پگڑی باندھی اور اپنے بیوی بچوں کو آواز دی کہ وہ بھی سڑک کے اس کنارے آ جائیں۔

گرد دائیں طرف زمین اور آسمان کے درمیان جا کر معلق ہو گئی تھی۔ جوں جوں ریوڑ آگے جاتا تھا۔ اس کی لکیر بڑھتی جاتی تھی ــــــ اس بڑھتی ہوئی لکیر کی طرف دیکھ کر اور دل ہی دل میں چرواہوں کو کئی فحش گالیاں دے کر آخر مولو نے کہا۔ "بد تمیز! نہیں جانتے کہ راستے میں شریف لوگ جا رہے ہیں۔ ذرا خبردار ہی کر دیں، کہ بھئی ایک طرف ہو جا، بس اڑے چلے جاتے ہیں، جیسے کوئی مہم سر کرنے جا رہے ہوں ــــــ حرام زادے ــــــ" اور اس نے اپنی مونچھوں کو دوبارہ پیار دیتے ہوئے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

شریف سے مولو کا کیا مطلب تھا؟ شاید یہ بات اسے خود بھی معلوم نہ تھی۔ وہ کاکڑاں کا تیلی تھا۔ گاؤں کے اس کنارے، جہاں بڑ کا ایک مہیب درخت بڑھ کر آدھے جوہڑ کو اپنے سائے میں لے چکا تھا، اس نے ایک چھوٹا سا کولہو لگا رکھا تھا۔ بارش ہوتی، تو جوہڑ کا پانی اس کے کولہو کے قریب تک آجاتا، بارش کی وجہ سے راستہ مسدود ہو جاتا۔ ٹانگیں گھٹنوں تک کیچڑ میں دھنس جاتیں اور جوہڑ کے کنارے لگے ہوئے کوڑی کے ڈھیروں کی عفونت بڑ کے سائے کی نمی سے، جیسے وہیں جم کر رہ جاتی، لیکن اپنی زندگی کے پچپن سال مولو نے اسی کاکڑاں میں گزارے تھے، گاؤں سے بیس میل پرے کیا ہوتا ہے، اس کی اسے کوئی خبر نہ تھی۔ زندگی میں شاید دو چار ہی ایسے موقع آئے تھے، جب اسے ایسے دھلے ہوئے کپڑے پہننے میسّر ہوتے ہوں۔۔۔ عید کے موقع پر وہ یقیناً ہر سال کپڑے بدلا کرتا تھا، لیکن اس کا کپڑے بدلنا یہی ہوتا کہ ننگے بدن رہنے کی بجائے وہ اس دن قمیض بھی پہن لیتا یا بنیان۔ دھیلے کے ریٹھے لے کر انہیں مل ڈالتی۔۔۔۔ ورنہ اس کی عمر تو تیل میں سنے، کالے، چکٹ کپڑوں ہی میں گزر گئی تھی۔ جس طرح پاس رہتے ہوئے بھی جوہڑ کے غلیظ پانی اور اس کے کنارے لگے ہوئے کوڑی کے ڈھیروں ہی اس کے لیے عفونت نہ رہی تھی، اسی طرح تیل اور پسینے سے تر گندے، میلے، خستہ اور بوسیدہ کپڑوں کے لیے بھی اس کا احساس بالکل مر گیا تھا۔ رہی گزر تو تیل کے کام سے اس گاؤں میں گزر اوقات کی صورت نہ دیکھ کر اس نے وہیں کولہو کے ایک طرف چاک لگا رکھا تھا۔ جہاں وہ گھڑے، کوزے، ڈوے، دوریاں اور مٹکے بنایا کرتا تھا۔۔۔ ذات سے وہ کمہار تھا یا تیلی اس بات کا اسے خود بھی علم نہ تھا۔ اپنے دادا اور پھر اپنے باپ کو اس نے یہی کام کرتے دیکھا

تھا۔ اور جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ وہ یہی کہتے جا رہا تھا، جب اس کے
ہاتھ تیل میں نہ ہوتے تو مٹی میں ہوتے۔ نہ ہی تعلیم سو قرآن پاک کی کچھ آیتوں کے علاوہ
جو وہ بڑی محویت سے غلط تلفظ کے ساتھ پڑھا کرتا تھا اس نے وہ سب گالیاں سیکھی
تھیں، جو اس کے دادا، پھر باپ اور پھر بڑے بھائی دیا کرتے تھے ——— لیکن آج
اس مٹی اور اس ماحول کے خلاف، جس میں وہ پیدا ہوا، پلا اور پروان چڑھا تھا، اس
کے دل میں جو ایسا نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور وہ ان ننگے بدن، غلیظ تہمدوں میں
ملبوس چرواہوں کو بدتمیز سمجھنے لگا تو اس کی وجہ تھی، وہ اپنے اس چھوٹے بھائی کے
لڑکے کی شادی میں شامل ہونے کے لئے جا رہا تھا، جو لاہور میں رہتا تھا اور دیہاتیوں
کی نظروں میں شہر والے شریف یعنی با عزت ہوتے ہیں۔ اور چونکہ وہ شریف آدمی کے
لڑکے کی شادی میں جا رہا تھا۔ اس لئے خود بھی شریف تھا۔

ڈیرہ کے نزدیک ایک کھال پانی سے بھری ہوئی مرنے سے رینگ رہی تھی ہولو
نے اسے پار کیا۔ پھر گٹھڑی رکھ کو بچے کو ہاتھ بڑھا کو پکڑ لیا اور اس کی بیوی چھلانگ
مار کر ادھر آ گئی۔ رحماں پہلے خود آئی اور پھر اس نے مجھے کو پار آنے میں مدد دی، لیکن
لہراں کے جوتے کی کیل ابھر آئی تھی اور اس کی دائیں ایڑی میں زخم سا ہو گیا تھا۔ دھرتی
گرم لوہے کی طرح تپ رہی تھی۔ اس لئے وہ ننگے پاؤں چلنے کا حوصلہ نہ کر سکی تھی۔ اور
ایڑی اٹھائے، اپنے دوپٹے سے گردن کے پسینے کو پونچھتی ہوئی چلی آ رہی تھی ———
اور بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

"ارے تو پیچھے ہی لٹکتی چلی آ رہی ہے۔ چلا نہیں جاتا تجھ سے ؟" اور لمحہ بھر کے

لئے اپنی شرافت کو بھول کر اس نے ایک فحش گالی اپنی اس لڑکی کو دے ڈالی۔
"مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ مینخ نکل آئی ہے۔" اس نے روہنسی آواز میں کہا۔ مولو نے گٹھڑی اٹھا کر کنارے کے ایک جامن کے درخت کے نیچے رکھ دی۔ اور بولا "لا ادھر ہیں اس مینخ کو ٹھیک کر دوں ابھی گیارہ میل ہمیں جانا ہے۔"

بیباں اپنے آنچل سے اپنے آپ کو ہوا کرتی ہوئی وہیں درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھ گئی اور ننھے کو دودھ پلانے لگی۔

رحماں نے کھال کے پانی سے منہ دھویا اور گیلا ہاتھ فجے کے منہ پر پھیرا۔ اور رلیاں نے وہاں پہنچ کر جوتے اپنے باپ کو دیتے اور خود لنگڑاتی آکر اپنی ماں کے پاس بیٹھ گئی۔

مولو نے مینخ کو دیکھا۔ اس کی پتلی سی نوک، جس کا زنگ زخم کی نمی سے صاف ہو گیا تھا، کمسن باغی کی طرح سر اٹھائے چمک رہی تھی۔ کہیں سے ایک اینٹ کا ٹکڑا ڈھونڈ کر مولو نے اس کو توڑ دیا۔ اسے کند کر دیا۔ پے در پے چوٹوں سے اسے بہت زیادہ اندر کو دھکیل دیا اور پھر منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر تہمد کی الٹی طرف سے منہ پونچھتا ہوا، کچھ لمحے سستانے کے لئے اپنی بیوی کے پاس آ بیٹھا۔

"اڑھائی روپے" اس کی بیوی نے کہا۔ "جیسے ہمارے گھر روپوں کی بارش ہوتی ہو، اور پھر دیکھو اپنی تو جیسے ہو سو ہو، وہاں جائیں گے تو کیا خالی ہاتھ جائیں گے حسن خاں کے بچوں کے لئے بھلا کچھ نہ لے جائیں گے۔"

یہ حسن خاں، جو اپنی زندگی کے پچیس برس تک گاؤں میں صرف حسو کہلاتا رہا۔ لاہور میں ایشور سنگھ گورنمنٹ کانٹریکٹر کا میٹ تھا ــــ جب لوپو کے پاس

نہر بنی اور ٹھیکیدار ایشور سنگھ ادھر آیا تو نہ جانے کس طرح (مولو آج تک اس بات کو نہیں سمجھ سکا) حسو جا کر اس کے مزدوروں میں شامل ہو گیا ---- چھ آنے روز پر ---- پھر ٹھیکیدار ایشور سنگھ نے اس کے کام سے خوش ہو کر اسے پانچ روپے مہینے پر میٹ بنا لیا اور پھر آٹھ کر دیئے، اور جب اس کا کام ختم کر کے ٹھیکیدار ایشور سنگھ لاہور چلا گیا تو اپنے اس معتبر میٹ کو بھی ساتھ ہی لے گیا۔ گاؤں میں ایک بار جب وہ آیا۔ تو اس نے چوڑے پائنچوں کی شلوار، بوسکی کی دھاری دار قمیض، اور سر پر کُلّے دار صافہ پہن رکھا تھا۔ جس کا طرّہ ایک پھول کی طرح کھلا ہوا تھا ---- اسی دن سے حسّو حسن خاں بن گیا تھا اور اسی کے لڑکوں کے لئے مٹھائی لے جانے کا خیال میاں کو تھا۔

اس جامن کے سایے میں بیٹھے بیٹھے اپنی تہمد کی گانٹھ سے مولو نے سب پیسے نکالے، اکثر پر تیل اور مٹی کی کالی تہ جم گئی تھی، اور اگرچہ زمین سے نکال کر تہمد میں باندھنے سے پہلے انہیں اچھی طرح دھو لیا گیا تھا تو بھی تہمد کا وہ حصّہ، جس میں اس نے انہیں باندھا تھا۔ کالا ہو گیا تھا۔

اگرچہ وہ گھر سے انہیں گن کر لایا تھا پھر بھی گھاس پر تہمد کا ایک پلّا بچھا کر اس نے انہیں دوبارہ گنا۔ چار روپے اور کچھ آنے تھے، اور یہ رقم اس نے بڑی مشکل سے پیسہ پیسہ کر کے دو سال میں جمع کی تھی۔ جونہی حسّو کا لڑکا آٹھ سال کا ہوا اور اس کی سگائی ہوئی کہ انہیں اس بات کی فکر ہو گئی کہ اس کا نکاح بس اب نزدیک ہی ہے، اس لئے انہیں کچھ نہ کچھ پس انداز کرنا چاہیئے اور چونکہ حسّو نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ لڑکے کی شادی وہ اب لاہور ہی میں کرے گا، اس لئے دو سال سے وہ اس کے بیاہ کی بات سوچ رہے تھے پچھلے برس وہ صرف دو روپے بچا سکا تھا۔

اور اس سال صرف دو روپے اور کچھ آنے اور ان دو برسوں میں اس نے محنت بھی کم نہ کی تھی۔ جتنی سرسوں وہ حاصل کر سکتا تھا، اس نے حاصل کی تھی۔ اور جتنا تیل اور گرد کے پانچ دس گاؤں میں بیچا جا سکتا تھا، اس نے بیچا تھا۔ اور اپنی سپلائی کو بڑھانے کے لئے اس نے سرسوں میں توریا ملانے سے بھی پرہیز نہ کیا تھا پھر فصل کے دنوں میں اس نے کٹائی کا کام بھی کیا تھا۔ اور پیروں کے میلوں میں گھڑوں اور مٹکوں کی دوکان بھی لگائی تھی۔ لیکن اس پر بھی وہ گذشتہ دو برس میں یہی کچھ بچا سکا تھا۔ اور بے سالن کی سوکھی روٹی سے زیادہ انہیں کبھی کچھ میسّر نہ ہوا تھا ——— اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شادی کے خیال سے اس نے اپنی بیوی اور بیٹیوں کو گبرون کی ایک قمیض اور ورلیس کی ایک ستھنی سلوا دی تھی۔ خود بھی ایک تہمد اور صافہ لیا تھا اور نجے کو بھی چھوٹا سا تہمد لے دیا تھا۔ لیکن ان سب کے لئے تو وہ بجیلو شاہ کا قرض دار تھا۔ جس سے اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگلے سال وہ جتنا تیل نکالے گا، سب اس کی دوکان میں ڈال دے گا۔

وہیں جامن کے نیچے بیٹھے بیٹھے مولو حساب لگانے لگا۔ "اگر وہ اٹاری سے جا کر چڑھیں تو چار چار آنے تو موٹر کے لگیں گے۔ اس طرح ساڑھے چار ٹکٹوں کے ...

لیکن بیباں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "ساڑھے چار کیسے؟ نجے کا ٹکٹ کس طرح لگ سکتا ہے۔ ابھی کل کا تو بچہ ہے، تم اسے گودی میں اٹھا لینا۔"

"یہ موٹر والے ایک ہی شیطان ہوتے ہیں، اگر مانگیں گے تو،" مولو نے کہنا شروع کیا۔ "سنا ہے تین سال سے بڑے کا ٹکٹ لگتا ہے۔"

"ہاں لگتا ہے" بیباں بولی۔ "وہ نہ مانگیں تو بھی تم دے دینا۔"

"تو خیر"، مولو بولا۔ "ایک روپیہ ہی سہی، پھر لاہور شہر ہے، وہاں حسّو کی شان ہو گی۔ پیدل گھسٹتے ہوئے تو اس کے ہاں نہ جایا جا سکے گا۔ پڑوسی نہ کہیں گے۔ کیسے بھکمنگے رشتے دار ہیں۔ تین چار آنے تانگے پر بھی نہ خرچ کر سکے۔"

بیباں کو خود بھی اس بات کا یقین تھا اور اپنے بچوں کو بھی اس نے یہی یقین دلایا تھا کہ چچا کے گھر سے انہیں بہت کچھ ملے گا۔ اس لئے اس نے کہا۔ "ایک روپیہ کی مٹھائی حسّو کے بچوں کے لئے بھی لے جانا۔ جب وہ ہمارے بچوں کو اتنا کچھ دیں گے تو ہم کس طرح خالی ہاتھ جائیں گے۔" اور وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے حساب لگایا کہ اس طرح سب خرچ نکال کر ان کے پاس بارہ آنے ایک روپیہ بچ جاتے گا۔

ننھی لہراں نے اچانک کہا۔ "میرے پاؤں میں چھید ہو گیا ہے، میرا جوتا گھس گیا ہے، مجھے ایک جوتا لے دینا۔"

رحماں بولی۔ "مجھے ایک چنری کی ضرورت ہے، چچا کی لڑکی کے سامنے کیا میں یہ پھٹی ہوئی چنری پہنوں گی۔"

فجے نے کہا۔ "ابا ہم تو بوٹ لیں گے۔"

"چلو ہٹو" ——— بیباں نے ایک جھڑکی دی۔ "سات آٹھ دن وہاں رہنا ہے، تو کیا اپنے پاس ایک کانی کوڑی تک نہ رکھیں گے۔ پھر گرمی کی بہار ہے۔ راستے میں شربت لسّی ہی کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

لوپو کے پاس انہیں ایک تانگہ جاتا ہوا ملا۔ لیکن جب اس نے اٹاری کے پانچ پانچ آنے فی سواری مانگے تو مولو نے کچھ جواب نہ دیا۔ تہمد کو پھر اوپر ٹھونس کر، پگڑی

کے شملے سے گردن اور منہ کا پسینہ پونچھ کر، اور گٹھڑی کے بوجھ سے آہستہ آہستہ دبنے والی گردن کو اٹھا کر وہ چل پڑا۔

لہراں اور فجے نے ایک بار کہا۔ "ابا تانگہ"

کڑک کر مولوی نے انہیں چپ کرا دیا۔ بیباں نے بھی بچے کو کندھے سے لگا کر منہ میں انگلی ڈال کر اسے جھلاتے ہوئے.... او... او... کرنا شروع کر دیا اور جب اس پہ بھی بچہ نہ مانا تو قمیض کے بٹن کھول کر اپنی چھاتی نکال کر اس کے منہ میں دے دی۔

سڑک بالکل کچی تھی ــــ سڑک تو اسے نہ کہا جا سکتا تھا۔ کسی زمانے میں وہاں ضرور سڑک ہو گی۔ لیکن اب تو اس کی وسعت کو دیکھ کر، اس پر گرد کے کسی ایسے دریا کا گمان ہوتا تھا۔ جس کے دونوں کنارے وسیع ہوتے ہوتے اردگرد کی ویران زمین سے جا ملے تھے۔ ہاں دونوں طرف پر انہہ کے بے سود، ٹیڑھے میڑھے، سوکھے اور بدصورت درخت اس سڑک کے وجود کا پتہ دیتے تھے اور کہیں کہیں کوئی ببول کا درخت، اپنی کانٹے دار شاخوں کو سڑک پر پھیلائے ہوئے تھا۔ کہ اگر کہیں گرمی کی تمازت سے جلتا ہوا کوئی شخص سائے میں آنے کی کوشش کرے تو اس کی پگڑی اتر جاتے یا اس کا چہرہ زخمی ہو جائے۔

لہراں کے جوتے کی میخ پھر نکل آئی تھی۔ اور زخمی ایڑی کو وہ اور بھی زخمی کر رہی تھی۔ اس لئے اس نے جوتے ہاتھوں میں اٹھا لئے تھے گر وہ دہکتی ہوئی راکھ کی طرح جل رہی تھی۔ اور بارہا جب گرد میں ٹخنوں تک پاؤں دھنس جاتے تو سارے جسم میں ایک جلن کی لہر سی دوڑ جاتی لیکن میخ کی چبھن سے ٹیس کی لہر دوڑتی تھی۔ وہ شاید جلن کی اس لہر سے کم تکلیف

وہ تھی۔ اور جوتے اتارے وہ چلی جا رہی تھی۔ پر اس کے باوجود وہ سب سے پیچھے تھی۔ اور مولو اب بھی سب سے آگے تھا۔ اتنی عمر ہو گئی، مولو کبھی اس سڑک پہ نہ آیا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ یہ سڑک اتنی ویران اور اتنی واہیات ہے، تو وہ کبھی اس طرف کا رخ نہ کرتا۔ خصوصاً اس وقت جب بچے اس کے ساتھ ہوتے۔ اس کے کولہو پر تو بڑ کا گھنا سایہ تھا۔ اور کبھی کبھار ارد گرد کے دیہات میں نیل لے کر جانے یا پھر میلے ٹھیلے کے دنوں میں مٹی کے برتنوں کی دوکان لگانے کے سوا وہ کبھی گاؤں سے باہر نہ گیا تھا۔ اس نے کبھی اس طرف کا سفر نہ کیا تھا۔ اس کی دنیا تو بڑ کے ایک گھنے پیڑ کے سائے میں بستی تھی، جہاں جلتی ہوائیں بھی سرد ہو جاتی تھیں اور دوپہر کی دھوپ بھی ٹھنڈک پہنچاتی تھی اور کبھی جب وہ خدا کے حضور میں سر جھکاتا تو اس کا وجود اس کے دماغ میں آتا۔ وہ کچھ بڑ کے گھنے پیڑ ہی کی طرح کا ہوتا ——— بڑی بڑی لمبی شاخوں والا گھنا۔ سایے دار۔ تپتے دلوں کو ٹھنڈک پہنچانے والا۔ بے شمار گھونسلوں کو اپنی شاخوں میں چھپاتے ہوتے۔ لیکن یہ تپتی ویران دنیا۔ ہریالی کا ایک تنکا تک نہیں۔ اور اس کے درمیان کسی جلتے ہوئے تیر کی طرح، جلتی تپتی، جلاتی اور تپاتی ہوئی یہ سڑک! ——— اگر اسے معلوم ہوتا تو کبھی اپنے بچوں کو یوں ساتھ نہ لاتا ——— کبھی بھی نہ لاتا۔ لیکن اس خیال کو اس نے فوراً اپنے دل سے نکال دیا۔ اور وہ پھر اکڑ کر چلنے لگا۔ تہمد کو جھٹکا دینے یا قمیص کو جھاڑنے کا خیال وہ کب کا بھول چکا تھا ——— کوئی سائیکل سوار یا بھولا بھٹکا راہی بھی گزرتا تو اس پہ گرد کی تہ چھا جاتی۔ لو کبھی ادھر سے چلتی اور کبھی ادھر سے، اور کبھی کبھار کوئی بگولا، مٹی اڑاتا ہوا گزر جاتا ——— تہمد کا نیلاہٹ لئے ہوتے سفید رنگ اب مٹیالا ہو گیا تھا۔ پگڑی کی وہ دمک نہ رہی تھی

اور کپڑوں کی الٹی طرف سے چہرے یا گردن کا پسینہ پونچھنے کی بجائے اب وہ سیدھی طرف ہی کو کام میں لانے لگا تھا۔

اس سے کچھ فاصلے پر اس کی بیوی چلی جا رہی تھی۔ اس کی تمام تر کوشش بچے کو پچکارنے کی طرف لگی ہوئی تھی۔ پھر رحماں تھی ــــ اپنے خیالات کی دنیا میں مست شاید اپنے پڑوسی گوالے نورے کا خیال اسے اس چلچلاتی دھوپ کی شدت کو محسوس نہ ہونے دیتا تھا۔ اس کی انگلی تھامے فجا چلا آ رہا تھا ــــ جسے کبھی وہ اٹھا لیتی تھی، اور کمر، کندھا یا بازو تھک جانے پر پھر اتار دیتی تھی ــــ اس کا پھول سا چہرہ کمھلا گیا تھا، ہونٹ سوکھ گئے تھے، گندے، میلے ہاتھوں سے بار بار منہ کا پسینہ پونچھنے کی وجہ سے چہرے پر کئی داغ لگ گئے تھے، اور اس کی چال بتدریج دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔

نہر کے پل کو پار کر کے مولو نے دیکھا ــــ دائیں طرف ایک گھنا پیڑ ہے۔ مادہ بڑ کا ــــ جس کا تنا بہت اونچا نہیں اٹھتا۔ موٹی موٹی لمبی لمبی شاخیں سر کو چھوتی ہوئی چھتری کی طرح پھیلتی جاتی ہیں۔ اس کی شاخوں پر دو مور بیٹھے ہیں، بے فکر اور مست ان کے لمبے لمبے چمکیلے پنکھ دھرتی کو چھو رہے ہیں اور دور کسی کنوئیں کی گادھی پر بیٹھا ہوا کوئی جاٹ ہیر وارث شاہ الاپ رہا ہے ــــ اس کی سریلی، باریک لیکن اونچی آواز اس ویران خاموش دوپہر میں گونجتی، لہراتی ہوئی، اس تک آ رہی تھی۔

گھر آنان نے گل کیتی، بھابی اک جوگی نواں آیا نی
کنیں اوسدے درشنی مندراں نیں تے گلے سیلا عجب سہایا نی

ماضی کی بھولی بسری منزلوں کو پار کر کے آنے والی یاد کی طرح، نوخیز جوانی کے دن مولو کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے، جب وہ اپنے بڑ کی موٹی شاخ پر بیٹھ کر بانسی

آم یا جامن کے درخت سے پیٹھ لگاتے، ہیر وارث شاہ، گایا کرتا تھا۔ اور اس کے جی میں آئی کہ وہ پورے گلے سے تان لگاتے:

پھرے ڈھونڈوا وِچ حویلیاں دے، کوئی ادس نے لال گنوایا اِی

ہیرے کِسے رجّ لس دا ادہ پُتر، رُوپ تدھ تھیں دُون سوایا اِی

لیکن یہ تان اس کے جی ہی میں رہی۔ اپنی لمبی داڑھی، اپنے شریف لباس، اور اپنے پیچھے چلے آنے والے بچوں کا اسے خیال آگیا۔ اور اس کے دل سے ایک لمبا سانس نکل گیا۔

قریب قریب روتے ہوتے سوکھے گلے سے فجّے نے کہا۔ "ابا مجھے پیاس لگی ہے، ابا مجھے اٹھا لو۔"

اور مولو نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ "لہراں بے چاری تھک کر پرانہ کی ایک ٹیڑھی سی جڑ پر بیٹھ گئی۔

"مر گئی وہاں ہی تو،" کڑک کر مولو نے کہا۔

لہراں اٹھی اور لنگڑاتی لنگڑاتی چلنے لگی اور پھر اس نے مڑ کر اپنے بیٹے کو ڈانٹا کہ ذرا دم لے۔ وہ سامنے تو چوگاواں نظر آ رہا ہے، وہیں تمہیں لسّی پلائیں گے۔

اور چوگاواں تک تو وہ دونوں کسی نہ کسی طرح چلتے گئے تھے، لسّی پانی سے زیادہ ان کی تسکین کا باعث یہ خیال تھا کہ ابا وہاں سے ضرور تانگہ لے گا لیکن جب کچھ سستانے اور سوکھی روٹی اور تیل کے پکوڑوں کو، جو ان کے ابا نے اڈے سے لئے تھے، پانی کی مدد سے پیٹ میں پہنچانے کے بعد انہیں پھر کوئک مارچ کا حکم ہوا، تو وہ چل پڑے، لیکن مارچ نہیں کر سکے، چوگاواں سے رنی کے تک اس مارچ میں گیتی بانگنگ سٹیشن آتے، جب کہ وہ ایک بیمار تھکے ہوتے گھوڑے کی طرح اڑ گئے اور

جھڑکیاں، گالیاں، یا ایک دو بار چانٹے کھا کر پھر چل پڑے۔ لیکن دنی کے موڑ پر جو وہ رُکے، تو پھر نہیں بڑھے، تھپیڑ کھانے کے بعد بھی فجّائش سے مس نہ ہوا اور گالیاں کھا کر بھی لہراں بیٹھی دوپٹے سے آنسو پونچھتی رہی۔

دُلّو نے تانگے والے سے بالکل ہی نہ پوچھا ہو، یہ بات تو نہ تھی، پوچھا تھا، لیکن بغیر سوار ہونے کے خیال سے اور یہ معلوم کر کے کہ لوپوکے سے چوگاواں تک وہ گرد کا سمندر پار کرنے کے باوجود ابھی تک کراتے میں صرف ایک آنے کی تخفیف ہوتی ہے اور آگے سڑک پکّی ہے اور کہیں کہیں شیشم کے درخت بھی ہیں، وہ چل پڑا تھا۔

تھپیڑ کھا کر فجّا رونے لگا، لیکن اٹھا نہیں، تب بیبیاں نے اسے پیار دے کر اٹھانا چاہا اور ننھے کو رحماں کے حوالے کر کے اسے گود میں لے لیا، ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہی وہ سہم کر لپک اٹھی۔

"دیکھو تم اسے مار رہے ہو، اس کا بنڈا تو بھٹی بنا ہوا ہے۔"

اور تپ بخار کے زور سے تپے ہوئے اپنے لڑکے کے چہرے کو دیکھ کر دُلّو پگھل اٹھا، اور بادلِ نخواستہ ایک جاتے ہوئے تانگے کو روکا اور اتاری کا کرایہ پوچھا۔

"چار چار آنے۔"

"چار چار آنے! لیکن اتنا تو چوگاواں سے مانگتے تھے۔"

"تم کیا دیتے ہو۔"

"ایک ایک آنہ لے لو، تین ساڑھے تین میل ہم چل بھی تو آئے ہیں۔"

"تو وہیں سے جا کر چڑھ جاؤ"، اور تانگے والے نے ہنٹر گھمایا۔ "اور دادا تیری ماں مر جاتے۔" کہتے ہوئے اسے گھوڑے کی پیٹھ پر جما دیا۔

"چھ چھ پیسے لو۔" مولو بولا۔

لیکن گھوڑا چل پڑا۔

"دو دو آنے۔"

"اڑھائی آنے" اس نے حلق کی پوری آواز سے کہا۔

تانگہ کافی دور جا کر رُک گیا۔ سواریاں تو پوری تھیں، لیکن جاتے چور کی لنگوٹی ہی سہی، کے مصداق تانگے والے نے یہ دس بارہ آنے چھوڑ دینے مناسب نہ سمجھے۔

اگرچہ جہاں دو کی جگہ تھی وہاں چار بیٹھے اور سانس تک لینا مشکل ہو گیا۔ لیکن پھر بھی یہ کہنا بے جا نہیں کہ سب نے تانگے میں بیٹھ کر سکھ کا سانس لیا۔

جب پلک جھپکتے ہی دم سے کم مولو کو ایسا ہی معلوم ہوا) اٹاری کا موڑ آ گیا اور تانگے والے نے کہا کہ اگر جلدی لاہور کی لاری پکڑنا چاہتے ہو تو یہیں اتر جاؤ، تو مولو کے دل کو دھکا لگا۔

"اڈہ آ گیا؟" اس نے پوچھا۔

"اڈہ تو آگے ہے، لیکن یہاں اتر جاؤ گے تو جلدی موٹر مل جائے گی۔ نہیں تو اڈے پر بہت دیر تک بیٹھنا پڑے گا۔ وہاں اور لوگ بھی تو ہوتے ہیں، اور آج کل ٹریفک پولیس بھی بڑی سخت ہو گئی ہے۔"

یہ ٹریفک پولیس کیا بلا ہے، یہ بات مولو کی سمجھ میں نہیں آتی ہے، بھویں تریڑ کر۔ تانگے والے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا۔ "یہ سب چالاکیاں میں سمجھتا ہوں۔"

لیکن جب تانگے میں بیٹھی ہوئی، دوسری دو سواریاں بھی وہیں اتر پڑیں اور دوسروں نے بھی کہا کہ اگر لاری جلدی پکڑنی ہو تو یہیں اتر جاؤ تو وہ بھی اتر پڑا۔ لیکن گو ج کر

"بس یہیں تک لانے کے تم بارہ آنے مانگتے ہو۔"

تانگے والے نے کہا۔ "تمہاری مرضی ہے، تم اڈے تک چلے چلو۔"

مولو کا جی چاہ رہا تھا کہ اس پاجی تانگے والے کو اتار کر سڑک پر ٹپک دے۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "تم لیٹرے ہو۔"

تانگے والے نے ہنٹر اٹھایا۔ "زبان سنبھال کر بات کرو میاں!"

اس وقت بیباں تانگے سے اتر کر دونوں کے درمیان آگئی۔ "طیش میں نہ آؤ سجائی ہم پیسے مار کر لے نہ جائیں گے، آدمی آدمی تو دیکھ لیا کرو تم!"

مولو کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ یہ سن کر گالی دینے کی بجائے اس نے وہی کالے سیاہ ۸ پیسے تانگے والے کے ہاتھ پر گن دیئے۔ اور بچوں کو اتارنے لگا۔

"بارہ آنے تو اسے دے دیئے اب وہاں کس طرح کام چلے گا۔" بیباں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

مولو چیخ کر کچھ کہنے ہی لگا تھا۔ کہ اس کی نظر اپنے ننھے بچے کی طرف چلی گئی۔ جس کا چہرہ بخار کی شدت سے اور بھی سیاہ ہو رہا تھا۔ اس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ پھر کرتا اٹھا کر پیٹ کی حرارت دیکھی۔ "جسم تو اس کا جل رہا ہے۔" اس نے کہا، اور پھر ایک آتی ہوئی موٹر سے بچانے کے لئے اپنے بیوی بچوں کو ایک طرف کر کے، اور انہیں ساتھ ہی لے چلا۔

"ارے مولو! تم کدھر؟" حیرت سے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے ایک شخص نے پوچھا۔ جو مولو کے گاؤں ہی کا تھا۔

اور اس آواز میں مولو نے کہا۔ "حسن کے لڑکے کی شادی ہے، وہیں جارہا تھا کہ راستہ

ہیں لڑکوں کو بخار نے آدبایا۔"

"کہاں جا رہے ہو وہاں؟"

"وہاں اچھرہ میں ٹھیکیدار ایشور سنگھ رہتا ہے، وہیں جانا ہے، نہ ہوگا بھائی، تانگہ لے لیں گے۔ تین چار آنے دے دیں گے۔"

"تین چار آنے" وہ ہنسا، "تم لاہور کبھی گئے نہیں، ارے بھائی۔ وہاں ایک روپیہ سے کم میں تانگہ نہ جائے گا۔"

مولو نے ان نگاہوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ جو شاید کہہ رہی تھیں کہ ایک روپیہ کی مٹھائی حسن کے بچوں کے لئے بھی لینی ہے، اور پھر واپس آنے کے لئے بھی پیسے چاہئیں اور بیباں کی نگاہیں شاید کہہ رہی تھیں کہ اس موئے تانگے والے نے یوں ہی ہمارے بارہ آنے لوٹ لئے۔

"تم کدھر آئے تھے مہر خاں" مولو نے پوچھا۔

"بھیلو شاہ کی بوریاں سٹیشن پر چھوڑنے آیا تھا۔

"تو اب واپس جا رہے ہو۔"

"چلا ہی جا رہا ہوں، یونہی ذرا دم لینے کے لئے رک گیا تھا۔"

تب پھر مولو نے بیباں کی طرف اور بیباں نے مولو کی طرف دیکھا۔ اور مولو نے کہا۔ "کیا کہوں یار، حسنو نے تو بہتیرا کہا تھا کہ بیوی بچوں کے ساتھ آنا، لیکن یہاں آتے آتے بچے بیمار ہو گئے ہیں۔ فجا اور چراغ بخار سے تپ رہے ہیں اور لہراں کا پاؤں زخمی ہو گیا ہے، سوچتا ہوں کہیں تکلیف بڑھ نہ جائے۔ شادی کا معاملہ ہے کھانے پینے میں پرہیز رہنا نہیں اور پھر وہاں وہ بات تھوڑے ہی ہے جو اپنے گھر میں ہے۔"

"یہ ڈاکٹر سالے تو اچھے بھلے کو بیمار کہہ دیتے ہیں۔"

"ارے بابا ان تک ہماری پہنچ کہاں۔" اور پھر ایک بار اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر مولو نے کہا۔ "تم ایک مہربانی کرو مہر خاں، ان سب کو واپس لے جاؤ مجھے تو جانا ہی ہو گا کل برات چڑھے گی۔ لیکن ان سب کو تم لے جاؤ۔"

اور پھر اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے بیوی بچوں کو بیل گاڑی پر چڑھانا شروع کر دیا۔

مہر خاں گاڑی پر آ بیٹھا۔

"راستے میں بھیلو وال کے حکیم نرنجن داس سے کچھ دارو لیتی جانا" گاڑی کے پیچھے چلتے چلتے مولو نے اپنی بیوی سے کہا۔

اس وقت دور سڑک پر امرتسر کی طرف سے ایک لاری آتی ہوئی دکھائی دی۔

مولو نے جلدی جلدی اپنے بچوں کو پیار کیا۔

فجے کی جلتی ہوئی پیشانی کو چوما "تمہارے لئے ہم بوٹ لائیں گے۔"

لہراں کے سر پہ ہاتھ پھیرا "تمہارے لئے نیا جوتا لائیں گے۔"

رحماں کو ڈانٹا۔ "بچوں کا خیال رکھنا اور ماں سے لڑنا نہیں۔"

پھر گٹھڑی اٹھائے بھاگتا ہوا سیاہ سڑک پر آ کھڑا ہوا اور اس نے آتی ہوئی لاری کو روکنے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

جھٹکے

۱۷ نمبر میں شادی ہو رہی تھی۔

۳ نمبر میں ہنس کی ماں اور دوسری عورتیں سرگوشیوں میں مصروف تھیں۔

"دروازے تو بند ہیں؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"۱۶ نمبر والی گوتو کی ماں نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا۔ تمہارا ہنس بھی تو وہیں ہے۔"

"میرا ہنس؟"

"گوتو کی ماں کہہ رہی تھی کہ وہی بھائی کی حیثیت سے کنیا دان کر رہا ہے۔"

"وہ کنیا دان کر رہا ہے، میرا ہنس؟"

"گونو کی ماں....."

"نہیں نہیں میرا ہنس کیسے ہو سکتا ہے؟ گونو کی ماں کو تو بے پر کی اڑانے کی سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔ ہنس اگر کینیا دان کرتا تو مجھے کیا اس شادی کا بھی پتہ نہ چلتا میرا بیٹا تو مجھ سے کوئی بات چھپاتا ہی نہیں۔ اور پھر وہ کہیں اس پاپ کے کام ہیں۔"

"میں پوچھتی ہوں ہنس کی ماں یہ لڑکی ہے کون؟ محلے میں تو چار دن سے طرح طرح کی باتیں ہو رہی ہیں۔ شرم حیا تو اس میں نام کو بھی نہیں۔ کل دفتر کو جاتے وقت اس نے بٹوا مانگا تو ننگے ہی سر باہر سڑک تک دوڑی آئی۔ شادی تو بھلا آج ہو رہی ہے۔ ہم تو کئی دن سے دیکھ رہے ہیں۔ اکٹھے بیٹھتے اٹھتے ہنستے کھیلتے ہیں"

"کئی دن سے ــــ انہیں تو آپس میں ملتے جلتے سال بھر ہو گیا ہے۔ میں سوچتی ہوں اس کی ماں کوئی اعتراض نہیں کرتی۔"

"ماؤں کو آج کل کے لڑکے کیا جانتے ہیں؟"

"میرا بیٹا ہو نہ ایسا نہر لچ ــــ میں تو اس کا منہ تک نہ دیکھوں۔"

اب سب کوئی ایک جیسے تھوڑا ہی ہوتے ہیں ــــ میرا ہنس کرے تو میری مرضی کے خلاف کوئی بات۔"

اس کا کوئی آگا پیچھا نہیں کیا؟

"ماں باپ تو نہیں، لیکن ماموں، چچے، تائے اور دوسرے رشتے دار ہیں۔"

"تو کیا ان سب کو چھوڑ کر آ گئی۔"

"اور کیا! سو روپیہ پاتی ہے۔ ان کی کیا پروا کرتی ہے۔"

"سو روپیہ، کہاں کام کرتی ہے؟"

"کہتے ہیں پنڈی کے کسی سکول میں ہیڈ مسٹریس ہے۔"

"پنڈی میں۔ تو اتنی دور کیسے آ گئی؟"

"ایسی پھر نکلیوں کے لئے دور کیا اور نزدیک کیا۔ جی آیا۔۔۔"

"رام رام بالڑکے لڑکیوں کے گھر بیاہنے جاتے تو سنتے تھے۔ لیکن لڑکی لڑکے کے گھر بیاہ کرنے آتے تو آج ہی سُنی۔"

"تبھی تو آج کل کی لڑکیاں شیطان کے کان کاٹتی ہیں۔ جن کی اُستانیاں ایسی چلتر ہوں وہ خود کیسے نہ ہوا سے باتیں کریں گی۔"

"ہم نے تو سُنا ہے اس کی پہلی بیوی بھی زندہ ہے۔"

"ابھی فروری میں تو شادی ہوتی تھی۔"

"اس لڑکی کو دیا نہیں آئی جو اپنی ہی ایک بہن کے گلے پر چھُری پھیرنے کو تیار ہو گئی۔ آخر اس کا کیا بنے گا؟"

"چھوڑ دے گا اور کیا؟"

"میرے سردار جی بھی ایک دن کہتے تھے، میں تمہیں چھوڑ کر دوسری شادی کر لوں گا۔"

"۔۔۔ ہاں کر لے گا۔ اس کی تو مذاق کی عادت ہے۔ ہنس رہا ہو گا ورنہ کیا سب اس جیسے لفنگے ہو جائیں گے؟ میرا ہنس بھی اپنی شادی پر ایسی ہی باتیں کرتا تھا۔ لیکن چھوڑنا تو دُور رہا مجال ہے جو میری بہو کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک تک پڑی ہو۔ ادھر بہو بیاہ کر لایا۔ اور ادھر رونے لگا۔ میری زندگی تمہیں نے تباہ کر دی ہے تم ہی اسے دیکھ کر آئی تھیں۔ کیا وہ میرے لائق ہے؟۔۔۔ سکڑی ہڑی، جلی بھُنی،

بدصورت اور پھوہڑ، بھدّے اور موٹے مذاق والی ـــــ بات کرتی ہے تو چہرے پر بیس زاویے بن جاتے ہیں ـــــ اور تو اور اس کے پتا تک کہنے لگے، میں ہنس کی دوسری شادی کر دوں گا۔ لیکن میں ماں ہو کر یہ سب کیسے برداشت کر لیتی؟ میرے آگے لڑکی نہیں کیا؟

میں نے دونوں کو ڈانٹ دیا۔ اور میرا بیٹا اتنا فرمانبردار ہے کہ کُسکا تک نہیں اور اب تو دیکھو پرماتما کی کرپا سے اس کے گھر بال بچہ بھی ہونے والا ہے۔۔"

"میں تو سُنتی ہوں ہنس کی مرضی ہی سے یہ شادی ہوتی ہے گوتو کی ماں ہی کہتی تھی کہ ایک دن دونوں باتیں کر رہے تھے۔ ہنس اسے سمجھا رہا تھا۔ وہ میری زندگی تو برباد ہوتی۔ تم کیوں اسے تباہ کرتے ہو۔ اور پھر اس وقت جب تمہیں ایسی لائق اور سمجھدار بیوی ملتی ہے۔۔۔۔"

"وہ لائق ـــــ یہی لیاقت ہے نہ اس کی کہ سوت پر چڑھی آ رہی ہے اور یہ پڑھی لکھی کی باتیں ہیں۔ ان پڑھ ہوتی تو نہ جانے کون سے آسمان کو چھیدتی؟"

"وہ کب کہتی تھی گوتو کی ماں۔ میں پوچھوں گی نہ جا کر اس سے، کب ہنس نے یہ سب باتیں کیں؟ ہم سے اسے خدا واسطے کا بیر ہے۔ وہ وہ باتیں اڑاتی ہے جن کا سان ہو گا نہ گمان! میں کہتی ہوں اگر ہنس کی مرضی ہی سے ہوتی شادی تو مجھے اس کا پتہ بھی نہ چلتا؟ میرے سامنے تو اس نے کبھی اس کام کی تعریف نہیں کی۔ اتنے دنوں سے یہ لڑکی آتی ہوتی ہے، کہو تو ایک دن بھی میرے گھر آئی ہو۔ میں نے تو ہنس سے کہہ دیا تھا کہ بیٹا تیرا دوست ہے اسے کہہ دینا کہ میرے گھر نہ لائے۔ میں ایسی پاپن کا منہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ اور ہنس نے کہا تھا، نہیں ماں ایسی لڑکی کبھی ہمارے گھر آ سکتی ہے کیا؟"

اب جاکر بیٹھنے کا گیا ہے۔ دفتر میں اکٹھے کام کرتے ہیں۔ وہاں جا بیٹھا ہوگا۔ گوتو کی ماں...

"میں تو سوچتی ہوں ـــــ یہ ایک بیوی کے زندہ ہوتے ہوئے دوسری شادی کر رہا ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔ جنہوں نے پہلی بیوی کے مرنے کے بعد پھر کبھی شادی کی ہی نہیں۔"

"۱۵ نمبر کے سیٹھ جی کو دیکھ لو۔"

"ہاں ۱۵ نمبر کے سیٹھ جی کو دیکھ لو۔ چالیس برس کی بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ لیکن بیوی کی موت کے بعد مجال ہے جو شادی کا نام بھی لیا ہو۔"

۱۵ نمبر کے وہی سیٹھ صاحب اپنے برآمدے میں بیٹھے ہوئے، چند دوستوں سے گرج گرج کر کہہ رہے تھے:۔

"یہ محلّہ ہے یا کنجر خانہ۔ ہم یہ سب ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے محلّے کی بہو بیٹیوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟"

"میں کہتا ہوں اگر اسے جھک ہی مارنا تھی۔ تو کہیں مندر میں جاکر مار لیتا۔ یہ کیا ہوا کہ ایک بیسوا کو بھرے محلّے میں اندر ڈال کر دروازے بند کر کے شادی رچالی، میں کل ہی رائے صاحب سے کہوں گا کہ اسے فوراً نکال باہر کریں۔"

"سنتے ہیں رائے صاحب کے لڑکے سے اس کی دوستی ہے۔"

"پھر کیا ہوا۔ میں کہتا ہوں نہ نکالیں رائے صاحب میں اسے ایسا ٹھیک کر دوں گا کہ وہ بنیس ہزاری تو کیا، دلّی چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ یہ ایک شخص کا سوال نہیں۔ یہ سارے محلّے کا سوال ہے، ساری سوسائٹی کا یہ سوال ہے۔ چار غنڈے پیچھے لگا دوں تو ہوش

ٹھکانے آجائیں۔"

اس کی اس ذرا سی بیوی ہی کو اٹھا کر لے جائیں۔"

"ہاں اور کیا۔"

"میں کہتا ہوں سیٹھ جی آپ تو اس کے سامنے ہی رہتے ہیں۔ آپ نے اسے سمجھایا نہیں۔"

"ہم سے وہ بات ہی کب کرتا ہے؟ دو مہینے ہو گئے اسے یہاں آتے ہوئے کبھی سلام دعا تک نہیں۔"

"اپنے آپ کو نہ جانے کیا خیال کرتا ہے، ہم تو اس کے لئے جیسے بے وقوف ہیں۔ عقلمند بنا پھرتا ہے سالا۔ یہ عقلمندی کہاں کی ہے کہ . . .

"آخر اس کی پہلی بیوی میں نقص کیا ہے؟"

"یہی تو میں کہتا ہوں —— بیوی میں کوئی نقص ہو یا عیب ہو، وہ بانجھ ہو یا لنگڑی ہو، اس پر فالج گر پڑا ہو۔ تو آدمی دوسری شادی بھی کر لے۔ اس میں تو کوئی نقص ہی نہیں، گوتو کی ماں نے اس کی ماں سے پوچھا تھا، کہتی تھی —— بڑی نیک ہے، ہنر مند ہے سلیقہ شعار ہے۔ کھانا پکانا سینا پرونا خوب جانتی ہے۔"

"اس کی ماں تو ایک طرف رہی۔ خود اس نے ایک دن مجھ سے کہا تھا —— اوسط آدمی کی نظر سے دیکھنے پر اس میں کوئی نقص نہیں۔ نیک سیرت ہے، میٹرک تک پڑھی بھی ہے۔ کھانا اچھا بنا لیتی ہے۔ اچھا سی پرو لیتی ہے۔ لیکن میرا اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ ہم دونوں میں کسی طرح کی ذہنی رفاقت نہیں۔ کوئی کلرک اسے پا کر خدا کا شکر ادا کرتا،"

"کلرک تو جیسے آدمی ہی نہیں۔ اپنے آپ کو لاٹ صاحب سمجھتا ہے، حرام زادہ۔"

"کہتا تھا میں اس کے ساتھ کھلی زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ مجھے اس کے سامنے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ جھوٹے وعدے کرنے پڑیں گے، جھوٹی محبت کا ناٹک کھیلنا پڑے گا—— نہیں یہ سب مجھے منظور نہیں، میں یا کھلی، سچی زندگی بسر کروں گا، یا اس سے کنارہ کروں گا، مجھے کھوکھلی زندگی پسند نہیں۔"

"اجی یہ ذہنی رفاقت اور کھوکھلی زندگی کی باتیں سب ڈھکوسلے ہیں۔ پوچھے کوئی اس سے کہ اگر تجھے تیرے جیسی کوئی بیوی نہ ملنی تھی تو تو نے شادی ہی کیوں کی؟ اپنا بچہ تھا، ...."

"بچہ؟"

"ہاں اس سے بھی پہلے ایک شادی ہوئی تھی، جس میں سے ایک سات آٹھ سال کا بچہ ہے۔ اسے چاہیئے تھا کہ اس کی غور پرداخت کرتا۔ آخر شادی کا مقصد ہی کیا ہے اولاد —— جو شخص اولاد ہوتے ہوئے بھی شادی کرے۔ اس جیسا مورکھ کوئی نہیں جب میری بیوی مری، میرا لڑکا صرف آٹھ سال کا تھا۔ اس وقت میری عمر بھی زیادہ نہ تھی بتیس، پینتیس کی ہو گی۔ رشتہ داروں نے دوسری شادی کر لینے کو بھی کہا، پر میں نے صاف انکار کر دیا۔ اپنے اس بچے کو پالا، پڑھایا لکھایا۔ ارے اس وقت کی بات کیا، ابھی پرسوں مجھ پر لالہ رام نارائن زور دے رہے تھے۔ کہہ رہے تھے۔ اب بھی آرام سے رہنا چاہتے ہو تو شادی کر لو، —— میں نے صاف کہہ دیا۔ میں آرام سے ہوں بڑ سکھی ہوں۔ یہ پاپ نہ کروں گا۔ میں یہ گناہ نہ کروں گا۔ یہ ...."

ادھر نمبر ۲ میں سردار جسونت سنگھ اپنی بیوی سے کہہ رہے تھے :-

"آخر وہ بُرا کیا کر رہا ہے۔ اس حرامزادے سیٹھ کی بات کر رہی ہو ــــ محلّہ اس سے نالاں ہے۔ کوئی لڑکی، کوئی بہو، کوئی استری گزرے۔ وہ گھٹنوں سے اُونچا انگوچھا پہنے ننگے بدن سر پر ہاتھ پھیرتا پھیرتا دروازے میں آکھڑا ہوتا ہے اور وہ اس کا بیٹا ــــ وہ کیا کرتا ہے؟ محلے بھر کی باتیں سونگھنے کے سوا اسے کام ہی کیا ہے؟ یہ لوگ دماغی تماشبینی کرتے ہیں ــــ فلاں کی لڑکی صبح اٹھ کر بال چھٹکاتی ہے۔ فلاں فلاں کی بیوی گھونگٹ کی اوٹ میں شکار کرتی ہے۔ فلاں کی بہن باجہ سکھانے والے ماسٹر سے سازباز رکھتی ہے۔ فلاں کی ماں اتنی پتلی دھوتی باندھتی ہے کہ سب کچھ دکھائی دیتا ہے ــــ ان سب باتوں کا ذکر کر کے لطف لینے کے سوا یہ اور کیا کرتے ہیں؟ بھوکے اور ندیدے کہیں کے! ان سب باتوں سے کیا یہ بدرجہا بہتر نہ تھا کہ وہ دھرم کا اوتار سیٹھ چپ چاپ دوسری شادی کر کے گھر بساتا! اور میں پوچھتا ہوں کہ ہم ہی کون سا بڑا تیر مار رہے ہیں۔ اس تمام بک بک جھک جھک سے کیا یہ اچھا نہ تھا کہ میں دوسری شادی کر لیتا۔ تم کیا سُکھ پاتی ہو میرے ساتھ ــــ؟ کونسا سکھ دیتی ہو مجھے؟ اور کونسا سکھ ہے جو ہمیں اب ملتا ہے اور تب نہ ملتا؟ تنگ کرتی ہو۔ روتی ہو، رُلاتی ہو۔ پٹتی ہو۔ پٹاتی ہو۔ میں خود سوچ رہا ہوں کہ اس سب جھوٹی زندگی کو ختم کر کے دوسری شادی کر لوں ...

اور نمبر ۳ میں نگینہ رام رتن سے کہہ رہا تھا ــــ

"میں کہتا ہوں اس میں کونسا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ لڑکیاں اس پہ مرتی ہیں۔ ہمیں تو کوئی سالی نہیں پوچھتی۔ اور ستم ظریفی دیکھو، میری بیوی یہ سمجھتی ہے

کہ دنیا جہان کی لڑکیاں مجھ پر فدا ہیں۔ ایک دن کہنے لگی میں تو صبح شام پرماتما سے یہی دعا مانگتی ہوں کہ آپ بالکل گنجے ہو جائیں۔ تاکہ میں ہی صرف آپ سے محبت کر سکوں۔"

"میں کہتا ہوں یار اسے تو کئی لڑکیوں کے خط آتے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔"

"یہی تو میں بھی کہتا ہوں —— ہمیں تو کوئی کمبخت خط نہیں لکھتی۔"

"بھئی بات یہ ہے۔ کہ وہ بہت اچھا مغنّی ہے۔"

"تو ہم کیا اتنی دیر بھاڑ ہی جھونکتے رہے ہیں، ہمارے سنگیت کو سن کر تو کبھی نے خط نہیں لکھا۔ اتنی دور سے بھاگ کر چلے آنا۔ اور شادی کے لئے تیار ہو جانا تو دُور رہا ہے۔"

"یہی میں بھی سوچا کرتا ہوں۔ لیکن کوئی تو خوبی ہے نا اس میں آخر —— یوسف ثانی تو وہ ہے نہیں کہ لڑکیاں اس کی خوبصورتی پر مرتی ہوں۔ میں کہتا ہوں۔ کہ شوہر کی حیثیت سے بھی وہ ایک نوجوان کنواری لڑکی کے لئے نہایت نامناسب قسم کا شخص ہے۔ جس شخص کی پہلی بیوی کو مرے ہوئے آٹھ برس ہو گئے ہوں۔ چھ سات برس کا ایک لڑکا موجود ہے۔ پھر یہی نہیں، دوسری بیوی زندہ ہو۔ اس سے اگر کوئی لڑکی شادی کرنے کو تیار ہو جائے۔ تو اس شخص کی قسمت اور ہمت پر رشک ہی آئے گا۔ اور پھر طرّہ یہ، کہ یہ لڑکی بدصورت نہیں۔ جاہل نہیں۔ بی۔ اے۔ بی ٹی ہے۔ ہیڈ مسٹرس ہے اور سو روپیہ تنخواہ پاتی ہے۔ دراصل بات یہ ہے —— کہ اسے لڑکیوں کی ہمدردی حاصل کر لینے کا گُر یاد ہے۔ سٹیشن ہی پر دیکھ لو وہ کتنی جلدی

عورتوں کی ہمدردی حاصل کر لیتا ہے۔ اور یہی ہمدردی بعد کو محبت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔"

"اس نرکھٹے سے شخص سے کس طرح انہیں محبت ہو جاتی ہے۔ میں اس پر حیران ہوں۔ ہم تو آج تک یہی سنتے آتے ہیں کہ لڑکیاں حسن اور طاقت پر ہی جان دیتی ہیں۔ ہم تو فضول ہی ڈنڑ پیل پیل کو مرا کئے میرا خیال ہے کہ آج کل کی لڑکیوں میں وہ دم خم ہی نہیں۔ جوان مرد سے وہ گھبرا جاتی ہیں... میں کہتا ہوں۔ یار وہ نرملا کیسی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے۔ اس کو باہوں میں لے کر اتنا بھینچوں کہ اس کا دم نکل جائے۔"

تم بھی بس وہ ہو، ارے نرملا میں کیا رکھا ہے۔ ہڈیاں ہی ہڈیاں ہیں۔ گوشت کا نام نہیں۔"

لیکن مل جائے تو کیا برا ہے؟"

"مل ہی جائے گی۔ اس کا کیا بھروسہ ہے: بھئی آج کی ان لڑکیوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ سرسری نظر سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ پلک جھپکتے ہی بغل میں آگریں گی لیکن پاس جانے پر اتنی ہی دور دکھائی دیتی ہیں۔ اور پھر میرا تجربہ تو یہ ہے کہ جو لڑکی ایک پر مرتی ہو۔ ضروری نہیں کہ وہ ہر جائی ہو۔"

"پسند تو میں بھی اسے نہیں کرتا۔ چھڑی سی ہڈی جیسی تو ہے۔ لیکن... میرا جی چاہتا ہے کہ ان سب سازوں کو اٹھا کر آگ میں جھونک دوں اور..."

"آپ کی چیزیں تو کلاسیکل ہوتی ہیں۔ انہیں تو اچھے اچھے مغنی نہیں سمجھ سکتے پھر یہ لڑکیاں کیا سمجھیں گی۔"

"نرملا تو ایم۔ اے ہے۔"

"ایم۔ اے ہونے سے کوئی سنگیت کا ماہر تو نہیں بن جاتا۔ یہ سب ولیسی ہی چیزیں پسند کرتی ہیں، جیسی کہ وہ گاتا ہے۔ سستی جذباتی بے مقصد اور بے سود۔۔۔

"میں کہتا ہوں یار، چمیلی کیسی ہے۔"

"کون چمیلی؟"

"ارے وہی جس کے نئے نئے ریکارڈ بھرے گئے ہیں؟

"کوئی اتنی خوبصورت تو نہیں، لیکن جسم اس کا ہمیشہ دعوت دیتا ہے۔ لیکن وہ تو مہنگی بیسوا ہے۔"

"لیکن یار غضب کا گدرایا ہوا جسم ہے اس کا، پندرہ سولہ سال کا سن ہوگا۔"

"اور گلا کیسا پایا ہے کمبخت نے؟"

"اور گول گول گلگو تھنے گال۔"

"اور آنکھیں بڑی مسکراتی!"

"زبان میں جادو ہے۔ باتیں کیا کرتی ہے۔ سحر پھونکتی ہے۔"

"اور چال ___ ہر گام پہ سوتے ہوئے فتنے جگاتی ہے۔"

"میں تو آج ضرور وہاں جاؤں گا ___ اٹھو نا ولٹی میں پکچر دیکھیں گے۔ کارونیشن میں کچھ پئیں پلائیں گے، اور پھر اُدھر چلیں گے۔ جلد اُٹھو۔۔۔ میرا جی چاہتا ہے کسی کو باہوں میں لے کر اتنا بھینچوں کہ اس کا دم نکل جائے۔"

کاٹو

کاٹو کا رنگ، شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں، کالا تھا۔ کالا ——— جس کے ساتھ سیاہ کا اسم صفت بھی لگا دیتے ہیں۔ اس کی آنکھوں کا رنگ شربتی تھا اور گہری بھوری پتلیوں کی جگہ اس کی آنکھوں میں ہلکی نیلی مٹیالے آسمان کے سے رنگ کی پتلیاں ٹمٹمایا کرتی تھیں ٹمٹماتی ہی تھیں، دمکتی نہ تھیں، جس طرح کہ دوسری صحت مند آنکھوں میں دمکا کرتی ہیں، کیونکہ وہ مادر زاد اندھا تھا۔

وہ اندھا تھا۔ لیکن اندھوں کا سا کمتری کا جذبہ اس میں یکسر مفقود تھا۔ اونچا لمبا قد، کھلے سڈول اعضا، گٹھا ہوا جسم، اور خونخوار شکل و صورت، جب وہ لیٹا ہوتا تو کسی دشمن کی کیا مجال کہ اس کے پاس سے غراہٹ سُنے بغیر گزر جاتے۔ مجھے تو بہت دیر تک اس بات کا بھی پتہ نہیں لگا کہ وہ اندھا ہے ——— مادر زاد اندھا!

آج اگرچہ میری عمر تیس برس کے قریب ہونے کو آئی ہے اور ہندوستان جنت نشان میں جہاں اوسط آدمی کی عمر تیس برس کی ہے۔ ۳۰ سال کا ہو جانا پختہ عمر ہو جانے کے مترادف ہے، لیکن اس کے باوجود مجھ میں اب تک بچپن کی کچھ عادتیں بدستور موجود ہیں۔ اسی عادت کو لیجیے ـــــ جہاں دوسرے لوگ مشترکہ ڈائننگ ہال سے کھانا کھا چکنے کے بعد رسوئی کے ساتھ بنی ہوئی جگہ برتن رکھ کر ہاتھ دھونے کے لئے جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہیں، میں اپنی طشتری سے بچی ہوئی روٹی اٹھا کر کوؤں اور کتوں کو اکٹھا کر لیتا ہوں۔

اور پھر وہ ایک ڈیڑھ روٹی ایک دم کوؤں اور کتوں کو ڈال کر میں اپنے کام میں مصروف نہیں ہو جاتا ـــــ یہ سب میں کارِ ثواب سمجھ کر نہیں کرتا مجھے ایسا کرنے میں لطف حاصل ہوتا ہے۔ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوا میں اچھالتا ہوں اور اگر کوئی چنچل کوا ہوا ہی میں اسے دبوچ لے یا کوئی شوخ کتا زمین پر گرنے سے پہلے ہی اسے لپک لے تو مجھے لاانتہا مسرت ہوتی ہے۔ کچن کے باہر جب کھانے کے بعد پانی یا لسی کا ٹھنڈا گلاس پینے کی وجہ سے جسم میں سردی کی جھرجھری سی اٹھتی ہے، تو وہی ایک ڈیڑھ روٹی کا ٹکڑا لے کر میں باہر دھوپ میں جا کر کھڑا ہوتا ہوں۔ اور اپنے بچپن کی عادت کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ میٹھی گرم دھوپ کا مزا بھی لے لیتا ہوں۔

سامنے حِنا کی باڑ سے پرے، بیت جھڑ کی وجہ سے سوکھی انار کی شاخوں پر سردی سے بچنے کے لئے اپنے پروں کو پھلائے سکڑی سی بیٹھی کوئی بلبل یا چڑیا ہمیشہ یہ تماشا دیکھا کرتی ہے، اور گیہوں کے چھوٹے سے کھیت کے پرے اپنے چوڑے چوڑے پتوں کو لئے ہوئے شٹالا اور ننھے ننھے پتوں کو لئے ہوئے کالی سینجی دھوپ میں کھل

رہی ہوتی ہے، منڈیروں پر لگے ہوئے سرسوں کے پیلے اور مونگرے کے نیلاہٹ لئے ہوتے سفید پھول اُچک اُچک کرتا کا کرتے ہیں اور دھوپ اس ڈائیننگ ہال کو، اس کے ارد گرد سبزی کے کھیتوں کو، ان سے پرے کراہ سے ہموار ہوتی ہوئی زمین کو اور پھر بنجر میں تنہا کھڑے ببول کے درخت کو اور حدِ نظر کے پاس آموں کے گھنے باغ کو اپنی آغوش میں لیتے ہوتے ہوتی ہے۔ اور میں اس نکھری، گرم، میٹھی، پیار بھری دھوپ میں روٹی کے ٹکڑے اُچھالا کرتا ہوں۔

جس طرح مُردار سے گِدھ کا تعلق ہے، اسی طرح انسان سے کتّوں کا۔ کسی ویرانے میں جہاں دُور دُور تک درختوں کا نشان نہ ہو، کوئی نعش پھینک دیجئے، دوسرے ہی دن اپنی لمبی گردنیں بڑھائے، چیختے، جھپٹتے گدھ اس کے ارد گرد اکٹھے ہو جائیں گے یہی حال کتّوں کا ہے۔ کسی بنجر میں کٹیا ڈال کر انسان روٹی بنانا شروع کر دے کچھ ہی دنوں کے بعد اسے رسوئی کے باہر ایک دوسرے کو بھونکتے، نوچتے، غرّاتے کتّوں کی آواز سنائی دینے لگے گی۔

میں بھی جب پریت نگر میں آیا تھا، یہاں ایک بھی کتّا نہ تھا۔ لیکن اب میں روز اپنے ارد گرد کتّوں کی ایک فوج دیکھتا ہوں —— وہ ڈیرو کے کا شیرا جس کا رنگ بھورا ہے، صرف گردن پر سفیدی ہے، اور جس کی بھوری پیشانی پر ایک سفید سا تلک ہے، اور جس کی آنکھوں کے ڈھیلوں کے ارد گرد ہلکا گلابی رنگ ہے، اور اگر میں خاص کوشش نہ کروں تو کوتے تک کو لقمہ اٹھانے نہیں دیتا، اور وہ چنکبرا ڈوگ —— جو شاید چک مصری خاں سے آیا تھا —— جس کی پچھلی ٹانگوں پر دُم کے نیچے لمبے لمبے بال گھٹنوں تک چلے گئے ہیں اور جو بارہا اس ڈیرو کے کے شیر سے لوہا منوا لیتا ہے، اور وہ سفید

جسم پر بھورے سے داغ، تھوتھنی پر سیاہی لئے بھوری پتلیوں والا کتا، جو خونخواری میں ان سے کسی طرح کم نہیں اور وہ چھوٹا سا بلّو، جسے سردار بخشیش سنگھ کے پیار نے یہ نام دے دیا ہے، ـــــ پھرتیلا، چھوٹے، کھڑے پان سے کانوں اور لمبی پتلی تھوتھنی والا جس کے آباواجداد ضرور ہی لومڑوں کی کسی نسل سے ہوں گے، اور وہ انگریزی نژاد بکّی، جسے ایک ـــــ عیسائی ماسٹر صاحب لائے تھے اور جو ان دیسی کتّوں کے ساتھ مل کر انہی سا آوارہ ہو گیا ہے اور وہ دُم پیٹ کے ساتھ لگائے محراب سا بنا، پرے پرے ہی پھرنے والا ڈرپوک، جس کی بھوک، معلوم ہوتا ہے خوشبو ہی سے مٹ جاتی ہے، اور وہ کتیا جو اپنے پیٹ میں سات آٹھ بچوں کا بوجھ اٹھائے پھرتی ہے، اور جس کی بھوک روز بروز بڑھتی جاتی ہے ـــــ یہ سب اور کئی دوسرے میرے ارد گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

انہی میں وہ ننھا کالا سیاہ، جیسا کہ میں نے کہا۔ صرف اس کے نیچے ٹخنوں تک چتکبرے تھے اور گھٹنوں پر ہلکی سی سفیدی تھی۔ طاقت میں وہ دیبو کے کے بھیڑیئے سے کم نہ تھا اور ان سب کتّوں میں جلد ہی مجھے اس سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ روٹی کو اوپر نہ جھپٹ سکتا تھا لیکن اگر میں روٹی دھرتی پر پھینک دوں تو اس کی آواز پر لپکتا تھا۔ اور کسی میں اتنی جرأت نہ ہوتی تھی کہ اسے اٹھا کر لے جائے۔ لیکن جب میں روٹی نہ پھینکتا، یا ان ہی کتّوں کی طرف پھینکتا جو انہیں اُچک کر جھپٹ سکیں تو وہ چپ چاپ میرے پاس کھڑا دُم ہلاتا اور اپنی مٹیالی نیلی پتلیوں کو پھراتا ہوا، میری طرف ایسی آنکھوں سے دیکھتا کہ میرے من میں کچھ رحم سا پیدا ہو جاتا۔ اور میں اپنے تماشے کو چھوڑ ساری کی ساری روٹی اس کے آگے پھینک کر پمپ پر ہاتھ دھونے اور منہ صاف کرنے چلا جاتا۔ سوچا کرتا کہ، "کیوں دوسروں کی طرح اُچک کر روٹی نہیں لیتا۔ اور

ایک دن جب وہ دھوپ میں برآمدے کی دیوار کے سہارے چارفٹ ٹانگیں اوپر کر کے لیٹا ہوا تھا۔ میں نے یہی بات کچن کے ہیڈ رسوئیے سے پوچھی۔

"کون، یہ سورداس"، کچن کی کھڑکی سے جھانک کر موہن سنگھ نے پوچھا۔

"سورداس"!

"ہاں جی، یہ بالکل اندھا ہے۔"

اور یہ کہتا ہوا موہن سنگھ کھڑکی کے باہر کود آیا۔

اس کی آواز کو سن کر، یا اس کے رسوئی کی خوشبو میں بسے ہوئے کپڑوں کی بو پا کر کالو کروٹ کے بل اچھل کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اور دم ہلانے لگا —— اور اس کے ڈھیلوں کی مٹیالی پتلیاں ٹمٹمانے لگیں۔

تبھی وہ چیک مصری خاں کا ڈگ بھی وہاں آ پہنچا۔ اس کی بو پا کر کالو غرایا۔

موہن سنگھ نے اس کی پیٹھ کو تھپتھپا کر کہا، "بس بچہ۔"

اور کالو لپکا۔

"پچ پچ، بس بچہ، بس۔"

اور کالو ڈگ کے سر پر جا سوار ہوا۔

"نڈر کتا ہے بابو جی۔" موہن سنگھ نے اپنی کھچڑی سی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اندھا تو ہے پر شیر دل تو شیر سے لڑ جاتے۔"

لیکن یہ شیر سے لڑنے والا کالو، اپنے سینے میں ایک نہایت نازک دل رکھتا ہے، اس کا مجھے بعد میں پتہ چلا۔ جب پانچ چھ ماہ کے بعد میں نے اسے پنکی کے ساتھ ساتھ

اس کے پیچھے گھومتے دیکھا۔

پینگی ایک چھوٹی سی کتیا تھی۔ قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے شاید بچوں نے اسے یہ نام دے دیا تھا۔ پتلی سی تھوتھنی، چست کھڑے کان، ہلکا بھورا سفیدی مائل رنگ، کانوں کے پاس بال لمبے اور ملائم تھے۔ ایک دن صبح صبح مجھے اس کے پیچھے سردی میں بڑی دور تک بھاگنا پڑا تھا۔ درحقیقت بات کچھ ایسی نہ تھی، میں اکیلا آدمی ہوں، کہنے کا مطلب یہ کہ میری بیوی نہیں، کئی برس ہوتے اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور اس تنہائی کی زندگی نے کئی وجوہات سے چھوٹی چھوٹی چیزوں کی قیمت میرے نزدیک بہت زیادہ بڑھا دی ہے، بھوک شاید مناسب لفظ نہیں ہے ——— ایک عجیب طرح کی چاہ سی میرے دل میں بیدار ہو جاتی ہے ——— گرم گرم دودھ کے لئے اور بار ہا میں ہاتھ میں کھانڈ کی پڑیا، ڈبل روٹی کے ایک دو سوکھے رس یا چلغوزے لے کر کچن میں چلا جاتا ہوں اور سو پیسے سے ڈیڑھ پاؤ یا آدھ سیر گرم دودھ لے آتا ہوں، اور پھر اس وسیع ڈائننگ ہال کے پچھلی طرف برآمدے میں، کھلی ہوتی دھوپ میں بیٹھ کر رس بھگو بھگو کر کھاتا ہوں، یا چلغوزے چٹختا اور زیادہ گرم ہونے کی وجہ سے ایک ایک چمچ دودھ پھونک مار کر پیتا ہوں، یا سامنے گوبھی، شلغم، یا گاجروں کی کیاریوں میں سردی کی طرف سے بے پروا مالی رام کو ہمیشہ کام کرتے دیکھتا ہوں، اور ساتھ ساتھ دودھ پیتا رہتا ہوں۔

لیکن گذشتہ سال سردی کچھ زیادہ پڑی تھی، پکّی دیواروں کو پار کر کے اندر گھس آتی تھی، لحاف جو اندر سے جسم کی حرارت کی وجہ سے گرم ہو جاتا، اوپر سے برف جیسا ٹھنڈا ہوتا۔ میں ان دنوں صبح دودھ پینے کے لئے کچن نہ جاتا، دھوپ ہی نہ نکلتی تھی، بارہ بارہ

بجے تک دھند چھائی رہتی تھی، شنگارا سنگھ جب گرم گرم دودھ کی بالٹی لے کر کوٹھی کوٹھی دیتا ہوا آتا تو میں اسی سے لے لیتا۔

چونکہ سردی زیادہ پڑنے لگی تھی۔ اس لئے میں نے ورزش کی مقدار بھی کچھ زیادہ بڑھا دی تھی اور گرم گرم دودھ کے لئے وہ چاہ سی بھی میرے دل میں بے حد زیادہ ہو گئی تھی اور چلغوزے اور رس مجھے کسی نعمت سے کم نہ دکھائی دیتے تھے۔

ان چار چھ آنے پاؤنڈ والے رسوں کو میں نے پہلے کبھی دیکھنا بھی پسند نہ کیا تھا اور چلغوزوں سے بھی مجھے نفرت سی رہی ہے۔ ہضم نہیں ہوتے —— میں ایسا سمجھتا آرہا ہوں۔ لیکن کبھی صحت ایسی بھی ہوتی ہے کہ معدہ پتھر تک ہضم کر جاتا ہے۔ پریت نگر لاہور سے تیس میل اور پکی سڑک سے دس میل دور دیہات میں بس رہا ہے۔ کھانا تو خیر جو کھانا چاہیں، کمیونٹی کچن میں کھا سکتے ہیں۔ لیکن اور چیزیں وہاں سٹور میں ملتی ہیں، اور جب وہ ختم ہو جاتی ہیں تو کبھی کبھی انتظار بھی کرنا پڑتا ہے۔

بیویوں والے تو گاجر کا حلوہ، دال کے لڈو، برفی، میسن اور بیسیوں چیزیں بنا چھوڑتے ہیں۔ لیکن میں ٹھہرا اکیلا۔ اس لئے میرے نزدیک رس ہی قیمتی اور پیاری چیز بن گئے تھے اور پھر تنہائی اور مصروفیت کی وجہ سے مجھے دنوں، تاریخوں اور وقت کا بھی پتہ نہیں رہتا۔ اور جب کوئی چیز ختم ہو جاتی ہے تو اسے لانا مجھے اسی وقت یاد آتا ہے۔ جب کہ بارہا سٹور بند ہو چکا ہوتا ہے اور کئی بار جب کھلا ہوتا ہے تو وہاں جانے پر پتہ چلتا ہے کہ چیز تو بہت پہلے کی ختم ہو گئی ہے۔ اس لئے میں زیادہ ضرورت کی چیزیں اکٹھی لے رکھتا ہوں اور ان بے حد ضروری چیزوں میں رسوں اور چلغوزوں کا نمبر سب سے پہلے آتا ہے۔

اس دن چلغوزے ختم ہو چکے تھے۔ اور شاید مہینے کے آخری دن ہونے کی وجہ سے سٹور میں بھی ختم ہی تھے، اس لئے میں رسوں پر ہی، ان میں سے بھی دو کی جگہ ایک ہی پر صبر کر لیا کرتا تھا۔

شنگارا سنگھ دودھ لے کر آگیا۔ میں نے ابھی مشکل سے ہی ورزش ختم کی تھی۔ میں نے رسوں کا لفافہ نکالا۔ لیکن اس وقت مجھے خیال آیا کہ مسواک تو میں نے کیا ہی نہیں، غسل کرنے کے بعد میں خواہ کچھ کھالوں لیکن مسواک کئے بغیر کوئی چیز میرے لئے نگلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر خیال آیا کہ مسواک لینے جاؤں گا تو دودھ ٹھنڈا ہو جائے گا اور میرے پاس نہ تھرماس ہے اور نہ اسٹوو، تب میں نے یہ فیصلہ کیا کہ چلو آج برش ہی کیا جائے اور یہ فیصلہ کرتے ہی لفافہ وہیں چھوڑ، دودھ کا گلاس ہاتھ ہی میں لئے ہوئے غسل خانے میں چلا آیا۔

گلاس کھڑکی میں رکھ کر میں برش کرنے لگا۔ برش کرنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ زبان صاف کرنے والا ٹنگ سکریپر تو وہیں کمرے میں چھوڑ آیا ہوں۔ اور میں کمرے کی طرف بڑھا اسی وقت مجھے کچھ گرنے کی آواز آئی۔ دیکھا تو وہ پینگی چق اٹھا کر دروازہ کھول کر اندر آگئی تھی، اور اس نے کھلی الماری میں سے رسوں کا لفافہ نیچے گرا لیا تھا۔ کئی رس ٹوٹ گئے تھے اور فرش رسوں کے چورے کی وجہ سے گندا ہو گیا تھا۔ ٹنگ سکریپر کو وہیں الماری میں پھینک میں نے رس اٹھائے اور انہیں لفافے میں ڈال کر الماری کے سب سے اوپر کے خانے میں رکھا۔ پھر چورے کو اٹھا کر باہر پھینکا اور فرش صاف کر کے ٹنگ سکریپر اٹھا کر دروازے کی چٹخنی لگا کر غسلخانے کی طرف بڑھا۔ دروازے ہی سے مجھے لپر لپر کی آواز آئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہی کمبخت پینگی کھڑکی میں رکھے ہوئے گلاس میں لپر لپر زبان چلا رہی ہے۔ غسلخانے کا دروازہ کھلا تھا۔ اور یقیناً وہ اس طرف سے آگئی تھی۔

غصّہ سے میری آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ چپّل اتار کر میں نے اس کے دے ماری۔

اس کے تو نہ لگی، البتّہ دودھ کا گلاس بھر بھرّ سے فرش پہ آرہا۔ غصّہ سے اندھا ہو کر میں بِلّی کے پیچھے باہر کو بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے دوسری چپل بھی اٹھا کر ہاتھ میں لے لی، اور میں بھول گیا کہ باہر کہرا جما ہوا ہے۔

دراصل اس بِلّی سے مجھے اور بھی شکایت تھی۔ کچھ دنوں سے میرے کمرے کے پیچھے اس نے بچے دے رکھے تھے۔ اور رتوں کی چیاؤں چیاؤں کی وجہ سے میری مختصر سی نیند بھی حرام ہو جاتی تھی اور پھر باہر خنکی زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے پلّوں کو لے کر میرے ہی برآمدے میں آجاتی تھی۔ جس دن غلطی سے پائدان باہر رہ جاتا۔ اس دن وہ سب پلّے اس پر آسوتے اور کئی بار اسے گندا کر جاتے۔

میں دانت پیستا ہوا، اندھا دھند اس کے پیچھے بھاگا جا رہا تھا، بچوں کی پیدائش اور اپنی بڑھی ہوئی بھوک کو پورے طور پر نہ مٹا سکنے کی وجہ سے وہ کچھ کمزور اور ناتواں ہو گئی تھی۔ لیکن جان کے خوف سے چیاؤں چیاؤں کرتی ہوئی دم کو پیٹ سے لگائے بھاگی جا رہی تھی۔ میرے پاؤں شل ہو رہے تھے، تیکھی ٹھنڈی ہوا سے میری ناک کی کوٹھی درد کرنے لگی تھی اور کانوں کے کناروں پہ چیونٹیاں سی چل رہی تھیں۔ لیکن میں انتقام کے اندھے جذبہ کے ماتحت بھاگا جا رہا تھا —— کئی لان، کھیت، میدان پار کر کے چکر کھا کر وہ اپنے بچوں کے پاس آکر دیوار سے دبک گئی۔ ہاتھ میں اٹھائی ہوئی چپل میں نے زور سے اس کے دے ماری —— ایک چیاؤں کر کے اس نے پیٹ دکھا دیا اور چاروں ٹانگیں اُوپر کی طرف کر دیں۔

میں نے وہ مصری بار دار کرنے کے لئے چپل اٹھائی تھی۔ لیکن اس کی عاجزی کو دیکھ کر میں اسے ہاتھ ہی میں لئے ہوئے مڑ آیا۔

اسی پٹنگی سے کالو کو محبت ہو گئی۔

اور کالو کا عشق کسی نوجوان کا بے پروا عشق نہ تھا بلکہ اس ادھیڑ کا عشق تھا جس نے بس پختہ عمری تک اس کا مزانہ چکھا ہو۔ اس عمر کے عشق میں نوجوان عشق کی سی بے پروائی ہرجائی پن اور بے وفائی نہیں ہوتی۔

کالو اندھا تھا۔ کسی مدھ ماتی کی رفاقت اسے آج تک حاصل نہ ہوتی تھی۔ جب بھی موسم بدلتا اور کوئی رفیقہ اپنے ساتھیوں سے کھیلنے، ان کے جسموں کو سونگھنے، یا ان کی گردنوں میں اپنے اگلے پنجے ڈال کر کھڑے ہونے میں لطف حاصل کرنے لگتی، تو پھر پانچ پانچ چھ چھ دن تک چک مصری خاں سے لے کر ویرو کے مالو پور کے یہاں تک کہ مجیلپوال تک کے کتے اس کے پیچھے چلنے لگتے۔ جہاں وہ جاتی، وہاں وہ جاتے، ان کے آگے آگے ہمیشہ وہ ویرو کے کا شیرہ یا وہ چک مصری خاں کا ڈگ یا پھر وہ سفید رنگ لیکن خونخوار تھوتھنی والا کتا ہوتا اور ان کا کام اپنے پیچھے آنے والوں کو آگے بڑھنے سے اپنی محبوبہ کے جسم کو چھونے کی کوشش کرنے سے روکنا ہوتا۔

کالو نے ویرو سے ان مہمون پر جانا چھوڑ رکھا تھا۔ بہار میں آئی ہوتی ساتھنوں کی چال میں کچھ عجیب طرح کی مستی، کچھ عجیب طرح کی تیزی آجاتی تھی۔ یہ جان کر کہ یہ سب فوج ان کے چاہنے والوں کی ہے، وہ مست البیلی چال سے چلتیں۔ اندھا کالو ان کا ساتھ نہ دے سکتا۔ اسے سونگھ سونگھ کر چلنا ہوتا۔ اسی طرح ایک بار جسم

کی ضربتوں سے مجبور ہو کر صرف بُو کے سہارے بھاگتا ہوا وہ گڑھے میں جا گرا تھا۔ سارا دن وہ پانی میں کھڑا چیختا رہا تھا۔ رات کے سنّاٹے میں جب اس کی پُر سوز چیخیں موہن سنگھ تک پہنچی تھیں تو اس نے اسے نکالا تھا۔ پانی اتنا گہرا نہیں تھا، ورنہ وہ اسی دن ختم ہو گیا ہوتا۔

وہ ڈائننگ ہال کے پچھلی طرف برآمدے میں پڑا دھوپ سینکتا، کھانے کے وقت چھین جھپٹ کر اپنا پیٹ بھر لیتا۔ (اور یوں بھی کچن کا ہیڈ رسوئیا، اسے بٹیا کہہ کر پکارتا تھا۔ اور کھانے کی اتنی فکر اسے نہ ہو سکتی تھی) اور رات کو تنور کے نیچے گرم راکھ میں پڑ کر سو رہتا۔ اس کی اس جگہ کو چھیننے کی ہمّت ابھی اس کے دوستوں میں سے کسی میں نہ تھی۔

لیکن گزشتہ بہار میں جب موسم بدلا، اور سرسوں کے پھولوں سے کھیت پیلے ہو گئے۔ گیہوں کو بالیاں لگ آئیں، آموں کے بور سے ہوا میں خوشبو بھر گئی اور ذرا دیر سے پھلنے والی بیریاں آنکھوں کی شکل کے بڑے بڑے بیروں کے بوجھ سے دھرتی کے ساتھ جا لگیں تو چتکی (جیسا کہ دیہاتی زبان میں کہا جاتا ہے) کتّ میں آ گئی رمشک گئی۔

دراصل چتکی کسی کی پالی ہوئی تو تھی نہیں اور آوارہ کتّوں میں مادہ سال میں دو دو اور کئی بار تین تین بار بھی جھل آتی ہے۔ اس کا جسم بھر گیا تھا۔ بالوں میں چمک آ گئی تھی کانوں کے بال زیادہ ملائم لگنے لگے تھے اور چک مصری خاں، ویرو کے اور لوپو کے کتّوں میں جنگ ہونے لگی تھی۔

انہی دنوں میں، جب ایک رات وہ تنور کے گڑھے میں ڈبّی کا سوراخ اس

کے بار بار گھس کر بیٹھنے سے کھلا ہو گیا تھا، سوراخ کے پاس اپنے اگلے پنجوں پر تھوتھنی رکھے اونگھ رہا تھا۔ (دن کو شاید زیادہ سویا تھا، یا ابھی رات زیادہ نہ گئی تھی) کہ اُس کی ناک میں کچھ ایسی بو آئی کہ اس کے اعضا تن گئے۔ اس نے ہوا میں پھر ایک بار سونگھا اور ایک سنسنی سی اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ وہاں بیٹھے رہنا اس کے لیے مشکل ہو گیا۔ اپنی آنکھوں کی کمی اور اس کمی کی وجہ سے گڑھے میں گر پڑنا اسے بھول گیا۔ وہ اٹھنے لگا، لیکن تبھی اسے اپنے اس غار کے باہر اپنے ساتھیوں کی بھوں بھوں اور پنج پنج کی آواز سنائی دی اور وہ مدھ بھری خوشبو اسے اور بھی نزدیک آتی محسوس ہوتی ۔۔۔ دو پہرے ملے اس نے گرم گرم سانس اپنی ناک پر محسوس کی ۔ پنگی باہر کی خنکی اور اپنے رفیقوں کی چھا چھا کوششوں سے تنگ آکر اس سوراخ میں گھس آئی تھی۔

ویرو کے کے شیر نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش کی، لیکن کالو کی ایک ہی پنج نے اس کی تھوتھنی کا گوشت نوچ لیا۔

اس نے ادھر سے ہٹ کر پنگی کے لئے کچھ جگہ بنا دی اور خود دہانے پر ڈٹ کر بیٹھ گیا۔

رات کی سخت سردی نے کتوں کی گرمی کو بھی ٹھنڈا کر دیا اور وہ زور زور سے چیختے ہوئے پناہ گاہوں میں بھاگ گئے اور کالو پنگی کے ساتھ سٹ کر بیٹھ گیا۔ ہوا میں بار بار سونگھنے لگا۔ اور ہر سانس اس کے جسم میں آنند کی وہ لہر دوڑانے لگا۔ جس سے وہ اب تک بے بہرہ تھا۔

صبح کچن کے باہر موہن سنگھ، شنگارا سنگھ اور رہنگا سنگھ سے کہہ رہا تھا "اسے اس کو یہ بیٹھے بٹھائے کہاں سے مل گئی۔ دس بچے پیدا ہوں گے۔ ہاں بر بیچاری ہے یہ کالو"

اور تینوں قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ اور وہ بیرو کے۔ کا شیر جو علی الصبح ہی آگیا تھا حسد اور شہوانی جذبہ سے مجبور ہو کر زور زور سے بھونکنے لگا۔

لیکن اس دن سے میں نے کالو میں ایک نئی تبدیلی دیکھی۔ اس نے اپنی آرام کی جگہ چھوڑ دی اور پینکی کے ساتھ ساتھ پھرنے لگا۔ میں بارہا انہیں اکٹھے دیکھتا —— پینکی ذرا آگے ہوتی اور کالو ذرا پیچھے، اس طرح کہ جہاں پینکی کی اگلی ٹانگیں ہوتیں، وہاں کالو کی تھوتھنی ہوتی اور اگرچہ وہ اب ماپ کر قدم رکھتا ہوا دکھائی دیتا تو بھی اس کی چال میں ایک طرح کی روانی آگئی تھی۔ شاید اب اسے گدھوں وغیرہ کا بھی خوف نہ رہا تھا پینکی کے جسم کی نزدیکی کو محسوس کرتا ہوا وہ بے خطرہ چلا جاتا۔

رات کو اگرچہ سردی ہوتی لیکن دن کے وقت کافی گرمی پڑنے لگی تھی۔ خلا میں لہریے سے بننے لگتے۔ آنکھیں دھوپ میں ٹکتی نہ تھیں، اور میں نے گھر میں کھانا منگانا شروع کر دیا تھا۔ میرا لڑکا بھی میرے پاس آگیا تھا۔ چھوٹا بھائی تھا گھر میں ٹھنڈے فرش پر چٹائی بچھا کر، کسی طرح کے تکلف کے بغیر ہم کھانا کھاتے —— تب پینکی اور کالو کچن سے نوکر کے پیچھے آکر سامنے برآمدے میں بیٹھ جاتے —— پینکی ہمیشہ ذرا آگے بیٹھتی اور کالو ہمیشہ ذرا پیچھے۔

کھانا کھا کر میں روٹی پھینکتا پینکی جھپٹتی۔ اس کی بھوک معلوم ہوتا ہے اب پھر تیز ہو رہی تھی۔ اس کا حصہ اسے دے کر میں کالو کی طرف پھینکتا۔ وہ سونگھتا اور پیچھے ہٹ جاتا اور پینکی کو کھا لینے دیتا۔

ان آوارہ کتوں میں اپنی محبوبہ سے ایسی محبت میں نے پہلی ہی بار دیکھی —— وہ

پُرخلوص، وفاداری اور ایثار سے بھری ہوئی محبّت! ویہودکے اور چک مصری خاں کے ان غنڈوں کو میں نے ایک ایک دن میں دو دو سانتھوں کے پیچھے پھرتے دیکھا تھا لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ اسے یاد کر کے میں کئی بار سوچا کرتا ہوں کہ کالو کتا ہی تھا یا کسی گذشتہ جنم کا کوئی ناکام پریمی۔

میری عادت ہے کہ میں شام کو دفتر سے آکر سیدھا غسل خانے میں جاتا ہوں۔ پہلے منہ ہاتھ دھوتا ہوں اور پھر کسی کام کی طرف متوجّہ ہوتا ہوں۔ پریت نگر میں غسل خانوں کے دروازے عام طور پر کھلے رہتے ہیں اور میرے یہاں تو قریب قریب سبھی کمروں کے دروازے کھلے رہتے تھے۔ اس دن میں اندر سے غسل خانے کو جانے کی بجائے باہر سے داخل ہونے کے لئے بڑھا۔ (شاید کوئی ضروری کام تھا اور میں کپڑے تبدیل کئے بغیر منہ ہاتھ دھو لینا چاہتا تھا) غسل خانے کے باہر کالو بیٹھا تھا۔ اپنی دھن میں قریب قریب اس کے اوپر سے گزرتا ہوا میں غسل خانے میں داخل ہوا۔ دیکھا تو نالی کے پاس سیمنٹ کے کھرے پر چتکبی لیٹی ہوئی ہے۔

"ہشت ہشت!" میں نے اسے بھگانا چاہا۔

وہ تڑپ کر رہ گئی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن اٹھ نہ سکی۔ میں نے دیکھا، اس کی ٹانگ پر ایک بہت بڑا — قریب قریب آدھی ٹانگ پر پھیلا ہوا زخم ہے۔ اس وقت مجھے یاد آیا کہ دوپہر کو کالو روٹی لینے نہ آیا تھا اور غسلخانے کے باہر بیٹھا تھا۔

آوارہ کتّوں میں بھی باہمی جنگ ہوتی رہتی ہے، عداوتیں اور حسد بھی ان میں کم نہیں ہوتے شاید اس چک مصری خاں کے ڈگ یا اس ویہودکے کے غنڈے نے اپنی گذشتہ ناکامی کا بدلہ لیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے ہی گاؤں کے ڈُلے نے اپنی محبوبہ

حسنا کی ناک اور کان کاٹ لئے تھے۔

اس کے بعد میں نے پینگی کو دو تین دن وہیں پڑے تڑپتے اور روز بروز نحیف وناتواں ہوتے اور کالو کو باہر بیٹھے دیکھا۔ پھر ایک دن جب میں دوپہر کے وقت گھر کھانا کھانے کے لئے آرہا تھا۔ میں نے پینگی کو سخت چلچلاتی دھوپ میں پڑے لان میں تڑپ تڑپ کر جان توڑتے دیکھا۔ شاید شیطان بچوں نے اسے غسلخانے سے باہر نکال دیا تھا وہیں سے میں واپس سردار بخشیش سنگھ کے پاس گیا۔ اور میں نے ان سے درخواست کی کہ اس غریب کو اس تڑپنے سے نجات دلائیں۔ سردار بخشیش سنگھ میرے ساتھ آئے زخم کو دیکھ کر انہوں نے کہا۔ یہ نہیں بچ سکتی اسے کیڑے پڑ گئے ہیں اور انہوں نے اپنی بندوق لاکر اس کی اذیت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

اس کی نعش کو سندر بھنگی دور بڑ کے عظیم درخت کے پیچھے پھینک آیا اور میں نے دو ایک بار گدھوں کو اپنی لمبی گردنیں بڑھاتے بڑے بڑے پروں کو پھڑپھڑاتے اس طرف جاتے دیکھا۔

لیکن کالو اس دن کے بعد پھر کہیں دکھائی نہ دیا۔ نہ جانے وہ کہاں چلا گیا ــ کیونکہ ارد گرد کے مزدوروں سے میں پوچھتا رہتا ہوں کہ انہوں نے اپنے گاؤں میں کبھی کالو کو دیکھا ہے۔ کالو کو جو کہ کالا تھا اور جس کے ہلکے شربتی ڈیلوں میں شہابی نیلی تیلیاں ٹمٹمایا کرتی تھیں۔ لیکن مجھے جواب ہمیشہ "نہیں" ملتا ہے اور کبھی جب ڈائننگ ہال کے باہر میں روٹیاں اچھالتا ہوں تو میری آنکھیں ہمیشہ دو ٹمٹماتی ہوئی پتلیوں کو دیکھنے کی ناکام کوشش کیا کرتی ہیں اور جب اندھیری سرد راتوں میں کتے چیختے ہیں اور اونچی لمبی آوازوں میں روتے ہیں تو مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا ہے، جیسے ان میں کہیں کالو کی ناکام روح بھی بے سود فریاد کر رہی ہے۔

چتین کی ماں

چتین کی ماں ان پتی برتا عورتوں میں سے تھی جنہیں دھرم شاستروں، پنڈتوں اور پروہتوں نے ہندوستان میں کثرت سے پیدا کر دیا ہے۔ وہ صرف سورگ پانے کی خاطر ہی اپنے پتی کو پرمیشور نہیں سمجھتیں بلکہ بچپن ہی سے انہیں بتایا جاتا ہے کہ شوہر اندھا، کانا، گنجا، لنگڑا، شرابی جواری کیسا بھی کیوں نہ ہو بیوی کے لئے وہ مجازی خدا کا درجہ رکھتا ہے اور اس کے حکم سے انحراف گناہ عظیم کے برابر ہے۔

اس کے پتا پنڈت شو رام ہوشیار پور میں پروہتائی کرتے تھے۔ ابھی وہ تین برس ہی کی تھی کہ اس کی ماں مر گئی۔ اس کے بعد اس کے والد کی دوسری شادی جلد نہ ہو سکی تھی۔ وہ کوئی اتنے امیر نہ تھے۔ ان کے ججمان بھی چند ایک ہی تھے اور پھر ہمارے ان قدیم محلوں میں جہاں جوڑنے والے دو ہیں — وہاں توڑنے والے چار! اس لئے بات کئی جگہ لگ کر بھی ٹوٹ گئی۔ آخر اپنی پہلی بیوی کی موت کے سات برس بعد ایک دن

جب پنڈت شوورام بظاہر اپنے بھائی کے ساتھ کسی دوسرے کی برات میں شامل ہونے کے لئے گئے تھے اور اس کے نانا نے چتین کی ماں سے کئی نئی نئی چیزیں لا دینے کا وعدہ کیا تھا، وہ حیران رہ گئی تھی۔ جب برات سے آنے والی مٹھائی کی گٹھڑی اور نئی نئی چیزوں کی بجائے اس کے پتا ایک نئی نویلی دلہن ہی لے آئے تھے۔

اس وقت ان کا اداس اور مغموم گھر مسرّت کا گہوارہ بن گیا تھا۔ حیران کر دینے والی رسموں بدھائیوں اور پڑوسیوں کے ہنسی مذاق میں اس کے بار بار پوچھنے پر اس کی پھوپھی نے صرف اتنا بتایا تھا "یہ تیری نئی ماں ہے۔"

اپنی پہلی (سگی) ماں کے بارے میں لاج وتی کو (کیونکہ یہی چتین کی ماں کا نام تھا) کچھ زیادہ معلوم نہ تھا۔ کبھی کبھی اس کے سامنے ایک بہت دھندلی سی — گویا برسوں پہلے دیکھے خواب کی سی ایک تصویر آ جایا کرتی — شاید مادری محبت سے محروم لڑکی کے تصور نے پتا کے روکھے سلوک کے باعث ہی اس کی ماں کی تصویر اس کے دل پر نقش کر دی تھی۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے اپنی ماں کو دیکھا ہے — گھر کے تاریک آنگن میں (جہاں ہمیشہ سیل اور نمی کے باعث ایک تیکھی سی بُو آتی رہتی تھی اور اوپر سے کھلا ہونے پر بھی جہاں روشنی کم ہی آ پاتی تھی) اس کی ماں ایک میلی سی کھاٹ پر کسی دھرم سانت یا شردھ میں آتے ہوتے (متواتر استعمال سے غلیظ ہو جانے والے) لحاف میں لپٹی ہوئی پڑی ہے — پیلا زرد چہرا، پچکے گال، حسرت بھری خمار آلود سی آنکھیں اور کانپتا سا ہاتھ اس کے سر پر اس نے بے لکڑی سا ہاتھ رکھ دیا ہے۔ اس کے ہونٹ سوکھے ہیں، بے رنگ اور بے جان، گویا خون کی آخری بوند تک ان میں سے نکل گئی ہے اور اس کے سر پر پیار کا

ہاتھ رکھتے ہوتے انہی سوکھے بے جان ہونٹوں سے اس نے کچھ کہا بھی۔ اس کے بعد یہ تصویر اور بھی دھندلی ہو جاتی تھی۔ اسے کچھ بھی یاد نہ آتا تھا۔ شاید اس وقت جب اس کی ماں اس طرح بستر مرگ پر پڑی تھی اور اس کے سر پہ پیار کا ہاتھ رکھے ہاتے لب کچھ کہہ رہی تھی اس کے تایا اس تاریک آنگن کے ساتھ ملحق دھوئیں بھری سیاہ کوٹھڑی میں (جاتے وغیرہ پی کر) اطمینان سے بیٹھے آہستہ آہستہ اپنا کبھی نہ دم لینے والا حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ مگر اسے پوری طرح کچھ بھی یاد نہ تھا۔ جب دکھ مصیبت بے عزتی، بدسلوکی، اور محبت کے فقدان کی وجہ سے چیتین کی ماں مضطرب ہوتی۔ اپنی ماں کی یہی تصویر اس کے سامنے آجاتی تھی اور اسے بے انتہا تسکین ملتی تھی۔

لیکن اس کی یہ نئی ماں تو اس کی ہم عمر ہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ وہ ایک برس بڑی ہوگی۔ دیہاتی ہونے کے سبب کچھ بڑی بڑی لگتی تھی —— چوڑے چوڑے ہاتھ پاؤں، کھلے کھلے بے ڈول اعضا، لمبی موٹی ناک، صحت ور جسم اور سانولا رنگ —— گنوار اور ناخواندہ! نہ اسے بال باندھنے کی تمیز تھی، نہ کپڑے پہننے کا شعور۔ نام تھا مالاں (مالن کا مخفف) اور چیتین کی ماں کو شش کرنے پر اسے اس نام کے علاوہ ماں یا بی بی یا بھابی کہہ کر نہ بلا سکی تھی۔

ماں باپ کی محبت سے محروم، دبے گھٹے رہنے والے بچوں کا ذہن یا تو بالکل کند ہو جاتا ہے یا اس میں ایک غیر معمولی ذہانت آجاتی ہے۔ چیتین کی ماں بھی بچپن ہی سے ذہین تھی۔ کمسنی ہی میں وہ بہت کچھ سمجھنے اور سوچنے لگی تھی۔ اس کی سہیلیاں ساتھ کے محلے کی پاٹھ شالا میں پڑھنے جاتی تھیں۔ لیکن اسے سکول جانے کی ممانعت تھی۔ آج کل کی طرح اس وقت تعلیم نسواں عام نہ ہوئی تھی اس کے تیا اور تایا دونوں بڑا نے

خیال وقیانوسی آدمی تھے اور اتنی بڑی لڑکی کا گھر سے نکلنا معیوب خیال کرتے تھے لیکن چنتین کی ماں نے اپنی سہیلیوں سے پوچھ پوچھ کر انہی کی کتابوں سے پڑھ پڑھ کر بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک دن جگدیش کے سارے قصّے لے کر پڑھ ڈالے۔

جگدیش اس کی پھوپھی کا لڑکا تھا۔ وہیں ان کے پاس رہا کرتا تھا۔ پڑھنا پڑھانا تو خاک بھی نہ تھا۔ ہاں قصّہ جو بھی نیا چھپتا خرید کر گھر لے آتا۔ پنڈت شورام نے ایک دن انہیں قصّوں میں سے ایک اپنی لڑکی کے ہاتھ میں دیکھ لیا تھا۔ غصّہ سے ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ اسی وقت انہوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر سب قصّے نکالے اور انہیں چولھے میں جھونک دیا۔ جگدیش کو اس کے باپ کے گھر بھیج دیا۔ اور چنتین کی ماں کو اتنا پھٹکارا کہ اس کے آنسو نکل آتے —— ان قصّوں میں کیا برائی ہے یہ بات ان دنوں اِس سادہ لوح بھولی بھالی لڑکی کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

اپنے لڑکے کی یہ بے عزتی ہوتے دیکھ کر پہلے تو پھوپھی نے پنڈت شورام کو طعنے دیئے کہ اب جب نئی بہو آگئی ہے تو میری یا میرے لڑکے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر بددعا دی کہ اس گنوار بہو کے ہاتھوں تیرا سارا گھر چوپٹ ہو جائے گا۔ پھر روئی اور پھر بوریا بستر باندھ کر اپنے گھر چلی گئی۔

اس وقت پڑھائی وغیرہ چھوڑ کر چنتین کی ماں نے اپنا دھیان سینے پرونے اور کشیدے کی طرف لگایا۔ اپنی سہیلیوں ہی سے پوچھ تاچھ کر اس نے بہت کچھ سیکھ لیا۔ اور اس طرح اس نے جو علم حاصل کیا وہ سب اپنی اس ننّی ماں کو مہذب اور سلیقہ شعار بنانے میں صرف کرنا شروع کر دیا۔

اس کے بال وہی گوندھتی۔ اسے کپڑے وہی پہناتی۔ اسے سینا پرونا وہی سکھاتی، اور

اس طرح اپنے آپ کو کسی قابل اور فائدہ مند بنانے کی سعی کرتی ـــــ لیکن نہ کبھی والد نے اس کے اس کام کی داد دی اور نہ ماں بن کر آنے والی اس گنوار اور غیر مہذب دیہاتی لڑکی نے۔ پتا تندمزاج تھے اور ماں کو داد دینے کی تمیز نہ تھی۔

چتین کی ماں اتنے ہی سے خوش تھی کہ ایک دن پنڈت شادی رام سے اس کا بیاہ ہو گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شادی کے فوراً بعد ہی وہ سسرال نہیں گئی اور پرانے رواج کے مطابق تین برس اور اپنے میکے میں رہی لیکن ان تین برسوں میں لڑکی سے دلہن بن جانے پر بھی اس کی روزانہ زندگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ہوا صرف یہ کہ گھر میں جو اس کی تھوڑی بہت عزت تھی وہ بھی جاتی رہی۔

بات یہ ہوئی کہ اس دوران میں اس کے چچا کی بھی شادی ہو گئی۔ اور اس کی چالاک چچی نے آتے ہی اس سوتیلی ماں کو اپنے بس میں کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب تین سال بعد ایک دن پنڈت شادی رام اچانک اسے لینے جا پہنچے تو اسے دکھ نہ ہوا ـــــ اس کی آنکھیں ضرور نم آلود ہو گئیں اور چلتے وقت وہ روئی بھی۔ لیکن یہ رونا اس خوشی کے لئے نہ تھا جو میکے میں عموماً لڑکیوں کو حاصل ہوتی ہے بلکہ اس خوشی کے فقدان کی وجہ سے تھا۔

اور اس وقت جب وہ تانگے میں جا بیٹھی تھی اور اس کے والد نے ٹھنڈے پیار کا ہاتھ اس کے سر پر پھیرا تھا تو چتین کی ماں کے سامنے سیل دار آنگن کی تاریکی میں پڑی اپنی بیمار نیم جان ماں کی تصویر گھوم گئی اور اس نے دوپٹے سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔

اس کے شوہر نے جس مکان میں اسے لاکر ٹھہرایا وہ اس کا اپنا نہ تھا اندازہ ہی سے چھنیّن کی ماں نے یہ بات جان لی۔ اپنے سسرال کے پرانے خستہ مکان کے بارے میں اس کے کان میں پہلے ہی کچھ نہ کچھ بھنک پڑ چکی تھی اور دل ہی دل میں اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بڑا تو بھلا تو جیسا بھی ہوگا وہ اسی کو سورگ سمجھے گی۔ اسی لئے جب پنڈت شادی رام نے اسے کسی دوسرے کے مکان میں لے جا کر ٹھہرایا تو اس نے ان سے استدعا کی کہ جیسا ہو اسے اپنے ہی گھر میں ٹھہرایا جائے۔ "جب ہمیشہ دوسرے کے گھر نہیں رہا جا سکتا" اس نے نہایت عاجزی سے کہا "اور آخر ایک دن اپنے گھر جانا ہے تو کیوں نہ ابھی سے وہاں رہنے کی عادت ڈالی جائے۔"

اور جب خستہ اور بوسیدہ ڈیوڑھی سے گزر کر (پاؤں کی آہٹ ہی سے جس کی چھت اور دیواروں سے مٹی گرتی تھی) وہ آنگن میں پہنچی تو لحظہ بھر کے لئے سکتے کے عالم میں کھڑی رہ گئی۔ میکے میں بھی اس کے والد کا گھر پرانا ہی تھا۔ تاریک اور بلمدار بھی تھا۔ اور خوبصورت بھی اسے نہیں کہا جا سکتا لیکن وہ گھر تو تھا یہ ــــ یہ تو کھنڈر تھا۔

آنگن کوڑے کرکٹ سے اٹا پڑا تھا، سارے فرش پر کوئلے بکھرے ہوئے تھے، کہیں کہیں ہڈیاں بھی تھیں (جنہیں شاید کوؤں اور چیلوں نے آسمان سے پھینکا تھا) سامنے کے دالان کی دیواریں چھوٹی چھوٹی اینٹیں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ پلستر تو کجا دروازوں کی مٹی تک بارش کی وجہ سے دھل گئی تھی۔ رسوئی خانے کے کواڑ خستہ اور بوسیدہ تھے اور کنڈی لگے ہونے کے باوجود ان میں اتنا شگاف تھا کہ کندھے تک بازو بڑی آسانی اندر چلا جاتا تھا۔ چوہے تو خیر بلی بھی چاہے تو سکڑ کر اندر گھس سکتی تھی۔ اسی دروازے سے نکل کر دھوئیں نے رسوئی گھر کے باہر کی دیوار کو بالکل سیاہ کر دیا تھا۔ بائیں طرف کا دالان جلا پڑا تھا اور گری ہوئی چھت کا ملبہ اور کوئلے دروازے کے باہر تک آگئے

تھے۔ اس کے ساتھ ہی ڈیوڑھی کی طرف کو ایک کھلی رسوئی اور تھی۔ آنگن کی منڈیر لپائی پتائی نہ ہونے کی وجہ سے لگاتار بارش کے باعث ننگی ہو گئی تھی۔ اور سامنے دالان کی منڈیر پر ایک غلیظ کریہہ منظر برہنہ شخص ایک ٹانگ ادھر اور ایک ٹانگ ادھر لٹکائے بیٹھا ہوا ہی ہیں کسی غیر مرئی ہستی کو للکار رہا تھا ——— ہاتھوں کو ایک دوسرے کے پاس لاکر ان سے ہوا میں آدمی بنا کر "لوہے کا آدمی" ——— "لکڑی کا آدمی" ——— "جا" کہتا ہوا وہ ان ہوا میں۔ بنے ہوئے آدمیوں کو گویا اس غیر مرئی ہستی سے جنگ کرنے کیلئے بھیج رہا تھا۔

لحظہ بھر کے لئے چیتن کی ماں اس ہٹی سے اُٹھے، گویا صدیوں سے غسل سے محروم برہنہ مگر وہ اس شخص کو دیکھتی رہی اور اس نے اپنے شوہر کے یہ الفاظ "چھٹی ہے پاگل!" نہیں سنے، لیکن تبھی اس پاگل نے ان کی طرف دیکھا اور دانت کٹکٹا کر ہوا میں لوہے اور لکڑی کے دو آدمی بنا کر ان کی طرف چھوڑ دیئے ——— روکھے خشک بال، چوڑی پیشانی، چپٹی ناک اور ہونٹ کٹے ہونے کے سبب باہر دکھائی دیتے ہوئے دانت ——— خوف کے باعث چیتن کی ماں دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

اپنی دلہن کو خوفزدہ دیکھ کر اس کا شوہر چھت پر گیا۔ اس نے اس پاگل کو بھگا دیا اور پھر واپس آکر اسے بتایا کہ وہ ان کا پاگل چچا ہے۔ اور یہ جلا دالان اور کھلی رسوئی اسی کی ہے، دیوانگی کی جھونک میں اس نے دالان کو آگ لگا دی تھی۔ اور پھر قدرے فخر کے ساتھ اس نے کہا، "بس اگر کسی سے ڈرتا ہے تو وہ میں ہوں۔ اس کی یہ ناک میں نے ہی توڑی ہے۔ ایک دن یہ گھر سے جاتا نہ تھا۔ دادی کو تنگ کرتا تھا۔ میں نے جانے کو کہا تو مجھ پر بھی جھپٹا۔ ٹینگ کر میں نے اسے اس دہلیز پر دے مارا۔ میرا بایاں ہاتھ اس کے ہاتھ میں آگیا۔ کچکچا کر اس نے دانتوں میں پکڑ لیا۔ میں نے کہا "چھوڑ!" اس

نے اور بھی زور سے کاٹا۔ تب میں نے پورے زور سے تان کر دو گھونسے رسید کئے۔ ناک کی کوٹھی ٹوٹ گئی اور ہونٹ پھٹ گئے۔ دادی کو سب سے زیادہ اسی پاگل سے پیار ہے۔ بہت روئی پیٹی لیکن اس کے بعد پھر یہ میرے سامنے نہیں آیا۔"

اور یہ کہہ کر دادخواہی کی غرض سے پنڈت شادی رام نے چھوٹی چھوٹی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اپنی اس نئی بیاہی بیوی کی طرف دیکھا۔ لیکن چیتن کی ماں کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور وہ سہمی ہوئی سی اپنے اس سنگ دل شوہر کو دیکھ رہی تھی۔

پنڈت شادی رام نے کچھ خفیف ہو کر کندھے جھاڑے اور چاروں طرف ایک نگاہ ڈال کر کہا۔ "میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ گھر تو بس کھنڈر ہی ہے۔"

اور ایک کھسانی سی ہنسی ان کی نوکدار مونچھوں میں پھوٹ نکلی۔

چیتن کی ماں کے چہرے کا رنگ واپس آگیا۔ اور اسے اپنا فیصلہ بھی یاد ہو آیا۔ "میرے لئے یہی سورگ ہے۔" اس نے زیرِ لب کہا اور آگے بڑھی۔

اس کے بعد کپڑے بدل کر آنگن کو جھاڑ پھونک کر اس نے کونوں ہڈیوں اور کوڑے کرکٹ کا انبار ایک کونے میں لگا دیا۔ اور دالان میں بھی صفائی کر کے ایک چارپائی کے لئے تھوڑی سی جگہ بنالی۔

یہیں اس کی سہاگ رات بسر ہوئی۔

اس کے بعد اس کے دن جس طرح گزرے ان کا مرقع کچھ یوں ہے:۔

آٹھویں جماعت ہی میں شراب پینا شروع کر کے اس کے شوہر نے اپنی شادی تک

سب طرح کے کام کو دیکھے تھے۔ اور ان لوگوں کے دل میں جو خود اتنے اچھے نہیں ہوتے دوسروں کی پاکبازی کے متعلق جو ایک طرح کا شبہ ہوتا ہے وہ پنڈت شادی رام کے دل میں بھی موجود تھا۔ وہ خود میٹرک پاس تھے۔ (در حقیقت ان دنوں شادی کوئی بی۔ اے تک جاتا تام ادب کے نام پر بھی اپنے وقت کے اکثر نوجوانوں کی طرح) انہوں نے "الف لیلہ"، "قصہ طوطا مینا"، "اسرار دربار حرام پور"، کی طرح کے ناول پڑھے تھے۔ جن میں تریا چرتر کے مفصل بیان اور نفسانی خواہشات کو بھڑکانے والے قصوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لئے وہ عورت کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں دنیا جہان کی عورتیں چالاکی اور عیاری کا مجسمہ تھیں اور وہ سنسکرت کا ایک شلوک پڑھا کرتے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ انسان کے بخت اور عورت کے چرتر کا اندازہ انسان تو کیا دیوتا بھی نہیں لگا سکتے۔ اس لئے وہ اپنے اصول کے مطابق (جس کا اعلان کرتے ہوتے وہ ایک پنجابی مثل "ڈنڈا پیر ہے وگڑیاں تگڑیاں دا"[1] سنایا کرتے) چیتن کی ماں کو اس کھنڈر میں بند کر جایا کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ جب گونے کے بعد وہ اپنی اس نئی بیوی کو لائے تھے تو دادی ججمانوں کے ہاں گئی ہوتی تھی اور پنڈت شادی رام کو پڑھانے کے لئے سکول جانا ہوتا تھا (جہاں میٹرک کا امتحان پاس کرتے ہی وہ ٹیچر مقرر ہو گئے تھے۔) اس لئے گھر میں اور کوئی نہ ہونے کی وجہ سے وہ جاتے وقت چیتن کی ماں کو اس پرانے کھنڈر میں بند کر کے باہر سے قفل چڑھا جایا کرتے تھے

اس کھنڈر سے مکان میں چیتن کی ماں کا دن کیسے گزرتا تھا۔ اس سلسلہ میں اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ اسے اپنی اس تنہائی سے نہ وحشت ہوتی تھی نہ نفرت اس کا

---

[1] ڈنڈا بگڑے ہوؤں کا استاد ہے:۔

دن کسی بے چینی سے نہ گزرتا تھا۔ اپنے شوہر کے اس ظلم کے خلاف بھی اس کے دل میں کسی قسم کی نفرت یا کدورت کا جذبہ پیدا ہوتا۔ اپنے کرموں کے پھل کو (کیونکہ وہ اس جنم کی مصیبتوں کو گذشتہ جنم کے اعمال کا ثمر سمجھتی تھی) اس نے نہایت صبر اور اطمینان سے برداشت کرنا بہت پہلے سیکھ لیا تھا۔ جب پنڈت شادی رام باہر سے قفل چڑھا جاتے تو وہ اپنی ددیا ساس[1] (پردادی گنگاوتی) کے ہاتھوں والان کے ایک کونے میں دبائی جمائی ہوئی چکی کو اپنی اس تنہائی کی رفیقہ بناتی ـــــ صبح کھانا بناکر اپنے شوہر کو کھلا پلا کر اسے بھیج کر (باہر سے اس کے تالا لگا دینے کے باوجود اندر سے کنڈی لگا کر) وہ چکی کے پاس آ بیٹھتی اور دوسرے دن کے لئے آٹا پیستی۔ کبھی دائیں کبھی بائیں اور کبھی دونوں ہاتھوں سے چکی کے دستے کو گھماتے ہوئے وہ میٹھے قریب پگھلے ہوئے سُر سے گایا بھی کرتی۔ میکے میں اس نے ایک دن اپنی پھوپھی کے لڑکے سے برہمانند کے "بھجن بدیوں" کی کتاب منگائی تھی۔ بار بار پڑھنے سے بہت سے بھجن اسے ازبر ہو گئے تھے۔ انہیں گاتے گاتے وہ بھگتی رس میں غرق ہو جاتی اور بھول جاتی کہ وہ اکیلی ہے، اس کا حال بے کیف اور اس کا مستقبل تاریک ہے ـــــ اس کے دل و دماغ پر ایک ناقابل بیان سکون مسلط ہو جاتا اور وہ ایک بہشتی اطمینان محسوس کیا کرتی۔

برہمانند کے بھجنوں کے علاوہ وہ دوسرے بھجن بھی گاتی۔ جیسے :-

کہو جی کیسے تار دو گے۔

---

[1] ساس کی ساس

رنکا تاری بنکا تاری تارہ یو سدن قصائی
سُوا پڑھادت گنکا تاری تاری میراں بائی
پربھو جی کیسے تاروں گے

بھجن گاتے گاتے وہ بے سدھ ہو جاتی۔ اور بارہا اس کا سُر ناک سے نکلنے لگتا (جیسے تاروں گے کی بجائے تارونگے) لیکن اس کی وجہ لاعلمی نہ تھی بلکہ وہ عقیدت تھی جس سے وہ اس لاشریک اور لامحدود ہستی کو مخاطب کرتی۔

"دکو مم گنتی تارے نا ہیں ٹرے"

دوسرا گیت تھا۔ جو وہ چکی پر گایا کرتی تھی۔

چکی کے بعد کئی بار وہ چرخا لے بیٹھتی اور اپنی سب تنہائی، خلا، اور دکھ کو گویا کات کات کر ٹوکری میں بند کر دیتی۔ ہیر رانجھا ناہی یا ڈھول کے گیت گانے کی بجائے چرخہ کاتتے وقت بھی وہ ایسے ہی گیت گایا کرتی جیسے:۔

ہری جی جو گزرے ہیتے،
چھوڑ خودی کی راہ راجاجی
جو گزرے ہیتے۔

اپنی سہیلیوں سے پوچھ پوچھ کر اس نے جو تھوڑا بہت پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ وہ بھی اس کے کم کام نہیں آیا۔ کبھی جب گھر میں روٹی یا گوڈر کچھ بھی نہ ہوتا تو وہ بھگوت گیتا لے بیٹھتی۔ وہ اس کے عظیم فلسفے سے بالکل بے بہرہ تھی۔ اس کے شلوکوں کو ٹھیک طرح پڑھ بھی نہ پاتی تھی۔ وہ تو محض عبادت کے طور پر اسے پڑھا کرتی ـــ اس کتاب کے شلوک طوطے کے منہ سے گننے پر جب گنگا جیسی بلیسوا تر گئی تو وہ گناہ گار

کیوں کر نہ ترجائے گی۔اس سے سچ مچ کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو۔ یہ بات نہ تھی۔اس نے یہی سیکھا تھا کہ جہاں تک ہو سکے ڈر کر رہنا چاہیئے۔ نہ جانے انسان سے دن بھر میں کتنے گناہ سرزد ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح اس کا دن بیت جاتا۔ جب پنڈت شادی رام آتے تو وہ یا کھانا پکا چکی ہوتی یا پکا رہی ہوتی۔ لیکن وقت پر ان کا آجانا کچھ یقینی نہ تھا۔ اس کی ازدواجی زندگی کے شروع میں (اور بدلے ہوئے اس منظر کے ساتھ بعد بھی) ایسے بہت سے دن آئے۔ جب وہ کھانا بنا کر اپنے شوہر کے انتظار میں بیٹھی رہی اور وہ رات رات بھر نہ آئے۔

ابھی اسے اس جیل خانے میں مقید ہوئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ سنکٹ چوتھ کا برت آگیا۔ چیتن کی ماں کے لئے یہ برت بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ صبح گنیش جی کا پاٹھ کر کے اس نے برت رکھ لیا۔ دن بھر اس نے پانی تک نہ پیا۔ جب شام کو آ کر پنڈت شادی رام نے کواڑ کھولے تو اس نے اپنے شوہر سے کہا کہ میں تو برت سے ہوں۔ مجھے تھوڑے سے تل اور گڑ لا دیجئے۔ تاکہ میں بُگا بنا کر شری گنیش کی پوجا کر کے برت کھول لوں۔ اس نے یہ درخواست بھی کی کہ کم سے کم آج آپ کہیں نہ جائیں۔

پنڈت شادی رام نے اسے یقین دلایا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔ اور جلد ہی آنے کا وعدہ کر کے وہ تل لینے چلے گئے۔

چیتن کی ماں نے ان کے لئے کھانا وغیرہ پکا لیا اور پھر وہ وہیں رسوئی گھر کے پاس آنگن میں بیٹھی ان کا انتظار کرنے لگی آہستہ آہستہ شام کی تاریکی آنگن پر

چھا گئی۔ سامنے کے مکان کی دیوار جو لگاتار بارش کی وجہ سے کالی پڑ گئی تھی۔ اس تاریکی میں اور بھی سیاہ دکھائی دینے لگی اور اس مکان کی چھت پر لگی ہوئی کوؤں کی محفل بھی برخاست ہو گئی۔ اوپر آسمان میں ایک دو تارے نکل آتے لاج ونتی نے اٹھ کر رسوئی کا دیا جلایا اور اسے رسوئی کے طاق میں رکھ کر نمسکار کیا۔ پھر وہ مونڈھے پر بیٹھ کر اپنے شوہر کا انتظار کرنے لگی۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے سنکٹ موچن، دکھ ہرن، بھگوان گجانن کا ورد شروع کر دیا اور کئی بار

جے گنیش، جے گنیش، جے گنیش دیوا

کا پاٹھ بھی کر لیا۔ لیکن جب پھر بھی پنڈت جی نہ آئے تو وہ دل ہی دل میں اس کہانی کو دہرانے لگی جو سنکٹ چوتھ کے دن برہمنی سنایا کرتی تھی۔ اس وقت برہمنی تو کیا آتی۔ اس نے خود ہی دل ہی دل میں وہ کہانی دہرائی۔

اور پھر دل ہی دل میں اس کہانی کو دہراتے ہوئے چیتن کی ماں نے عقیدت کے ساتھ بھگوان گنیش کے حضور میں سر جھکا کر پرارتھنا کی کہ اس کے سب سنکٹ دور ہو جائیں۔

اس برت کی اہمیت کے متعلق جو کہانیاں مشہور تھیں وہ سبھی اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے دہرا ڈالیں۔ لیکن پنڈت شادی رام نہ آئے۔ ارگھ دینے کا وقت ہو گیا۔ اب گھر میں پوتر اور پاکیزہ جل نہ تھا، جس سے چاند کو ارگھ دیا جاتے۔ ڈرتے ڈرتے وہ ڈیوڑھی میں گئی تاکہ دروازے کے پاس کھڑی ہو کر سامنے کے گھر میں رہنے والی برہمنی کو آواز دے۔ اس نے اندر سے کنڈی کھولی۔ لیکن اسے آواز دینے کی جرأت نہ ہوتی،

وہیں کواڑ سے سر لگاتے وہ کتنی دیر تک کھڑی رہی۔ آخر اس نے سر اٹھایا کواڑ ذرا سا اندر کو کھل گیا۔ چونکہ پنڈت جی کا خیال تھا کہ وہ جلدی واپس آجائیں گے۔ اس لئے وہ باہر سے قفل لگا کر نہ گئے تھے۔

سامنے کے مکان کا دروازہ بند تھا۔ محلے کے سرے پر میونسپل کمیٹی کا جو لیمپ رات بھر جلتا رہتا تھا۔ اس کی روشنی ان کے دروازے تک نہ پہنچتی تھی۔ تاریکی میں کھڑے کھڑے اس نے محلّے کی کئی عورتوں کو آتے جاتے دیکھا۔ لیکن اسے کسی کو آواز دینے کا حوصلہ نہ ہوا ـــــ بھوک پیاس اور تشویش سے اس کے ہونٹ سوکھ گئے تھے، حلق خشک ہو گیا تھا۔ اور جسم تھکن سے چور تھا۔ خواہش ہونے پر بھی آواز اس کے منہ سے نہ نکلی۔ اس وقت ملادی برہمنی اپنے گھر آئی۔ جب اپنی کوٹھڑی کے کواڑ کھول کر اس نے دیا جلایا تو بہو کو اپنے گھر کی چوکھٹ سے لگے کھڑے دیکھا۔ پاس آکر نہایت ہمدردانہ لہجے میں اس نے کہا۔

"شادی کی بہو ہے کیا؟ کیوں بچی تو اس طرح کیوں کھڑی ہے؟"

چیتن کی ماں پہلے پہل کچھ نہ کہہ سکی۔ دوبارہ پوچھنے پر اس نے تھوک نگل کر کہا۔

"مجھے کچھ تازہ جل چاہیئے تاکہ میں برت اپار کرسکوں۔"

ملادی نے اسے بخوشی پانی لا دیا۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ (پنڈت شادی رام) تو وہاں ولیسراج کے ہاں گٹ پڑا ہے۔ چیتن کی ماں کب تک اس کے آنے کا انتظار کرے گی۔ پھر اس نے یہ بھی پیش کش کی کہ اگر بھگا نہیں بنا تو وہ بازار سے دودھ ہی لا دیتی ہے۔ لیکن چیتن کی ماں کا دل اتنا اداس اور رنجیدہ تھا کہ چاند کو ارگھ دے کر پانی ہی کے دو گھونٹ پی کر اس نے برت اپار لیا۔ ملادی کو رخصت کیا اور ڈیوڑھی کا دروازہ لگا کر آنگن میں آ بیٹھی اور وقت کاٹنے کے لئے اس نے سنکٹ موچن، دکھ

ہرن بھگوان گجانن کا جاپ شروع کر دیا۔

جے گنیش، جے گنیش، جے گنیش دیوا!

اور نہ جانے کب تک وہیں بیٹھے بیٹھے جاپ کرتے کرتے اسے اونگھ آگئی۔

آدھی رات کے وقت پنڈت شادی رام نشے میں چور جھومتے جھامتے آئے اور انہوں نے باہر ہی سے نشے کی وجہ سے بھاری تھرتھرانی آواز میں پکارا۔ "دروازہ!"

چیتن کی ماں چونکی۔ لپک کر اس نے دروازہ کھولا اور اپنے شوہر کے اندر آنے پر بند کر دیا۔ اسے بغل میں لئے ہوئے، نشے میں جھومتے لڑکھڑاتے پنڈت شادی رام اندر دلان میں آئے۔ طاق میں سرسوں کے تیل کا ایک دیا ٹمٹما رہا تھا۔ اسی دیئے کی روشنی میں جب اس نے اپنے شوہر کی آنکھوں میں شہوانی چمک دیکھی تو بھوک، روزہ اور بے خوابی سے تھکی ہوئی اس کی روح کانپ اٹھی۔

لیکن دوسری صبح جب اس نے گلے کے انداز میں اپنے شوہر سے کہا کہ آپ مجھے اکیلے کیوں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں بیٹھی انتظار کرتی رہی۔ اور مجھے ملادی کی مدد لینی پڑی۔ تو ابھی اس نے اپنی بات مکمل بھی نہ کی تھی کہ اس کے شوہر نے اس کے منہ پر زور سے تھپڑ رسید کیا۔ ایسی گالیاں دیتے ہوئے، جو اس نے پہلی بار ہی سنی تھیں۔ اسے ڈانٹا کہ اگر تو ایک دن بھوکی رہ لیتی تو مر نہ جاتی۔ کیوں نہ تو نے میرے آنے کا انتظار کیا اور کیوں تو نے ملادی کو بلایا؟

چیتن کی ماں اپنے شوہر کے قدموں پہ گر پڑی اور اس نے گڑگڑا کر معافی مانگ لی۔

لیکن اس کے اس جرم کی سزا وہیں ختم نہ ہوئی۔ جب پردادی گنگادئی آئی اور اسے معلوم ہوا کہ اس کی غیر موجودگی میں کلموہی ملادی اس کے گھر آئی تھی تو اس نے بہو کو کو ڈانٹنے ڈپٹنے کے بعد ملادی اور اس کے گھر والوں کی سات پشتوں کا نام لے کر "میٹھے پکوں" کی بارش کی۔ اور سہمی ہوئی بہو نے دیکھا کہ اس کی ددیا ساس جب نہانے لگتی ہے تو ملادی اور اس کے مرحوم شوہر کا نام لے کر بد دعائیں دیتی ہے۔ (چیتن کی پردادی کا خیال تھا کہ نہاتے وقت بددعائیں عین نشانے پر جا کر بیٹھتی ہیں) اپنی ددیا ساس سے لاجوتی کی یہی پہلی ملاقات تھی۔

بعد کے ان لمبے تیس برسوں میں پہلے پردادی گنگادئی اور پھر چیتن کے پتا کے ہاتھوں چیتن کی ماں نے بے شمار ایسی اذیتیں سہیں۔ خواہش نہ ہونے پر بھی وہ اپنی ددیا ساس کی تمام پاٹھ پوجا، برت نیم، پیر فقیر، رسم رواج مانتی رہی۔ اس کی ڈانٹ پھٹکار سنتی رہی۔ ذہنی اور جسمانی اذیتیں سہتی رہی۔ اور پھر یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک اس ظالم بڑھیا کی موت نے چیتن کی ماں کو ان تمام اذیتوں سے نجات نہ دلادی۔

رہا اس کا شوہر تو اپنی ماں کی — موت پر اس نے اپنی اسی دادی کا دودھ پیا تھا۔ (کم سے کم چیتن کی پردادی یہی کہا کرتی تھی کہ اس کی چھاتیوں میں اس وقت دودھ اتر آیا تھا) پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ اس کے مزاج میں وہ کرختگی اور درشتی نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ کوئی بھی ایسا عیب نہ تھا، جو پنڈت شادی رام میں نہ آگیا ہو — شراب وہ روز پیتے، دیوالی کے دنوں میں جوا بھی کھیلتے (اور شراب

پی کر کھیلنے کے باعث ہمیشہ ہارتے) سٹّہ وہ لگاتے، اور دوسرے بیسیوں طریقوں سے روپیہ لٹاتے۔ اور پھر ایسے موقعوں کی بھی کمی نہیں۔ جب وہ دوسری عورتوں کو گھر ہی لے آتے اور ان کے سامنے (ان کے کہنے پر یا انھیں خوش کرنے کے لئے) انہوں نے چھیتن کی ماں کو نہایت بیدردی سے پیٹا۔ اس کے علاوہ انہوں نے عمر بھر (سکول کی ماسٹری چھوڑ کر تار بابو اسسٹنٹ اور پھر سٹیشن ماسٹر ہونے پر بھی) اسے کبھی بھڑکیلا کپڑا نہ پہننے دیا۔ وہ کبھی بھولے سے چھت پر چلی گئی تو بدچلنی کے بیس طعنے اسے دیئے۔ کبھی اس نے گھونگھٹ اونچا کیا تو بیس گالیاں دیں۔ اور ایک بار گلی میں اسے دیکھ لیا تو وہیں سے گھسیٹتے ہوئے اسے اندر لے گئے۔

لیکن اس کے باوجود چھیتن کی ماں نے اپنے اس شوہر کو اپنی سب محبت، سب عقیدت ادب اور احترام دیا۔ خواب میں بھی اس کا برا نہ چاہا۔ (یہ مبالغہ نہیں دھرم اور کرم کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ایسی بے شمار خواتین اس ہندوستان جنت نشان میں مل جائیں گی) ہمیشہ اس کی ترقی اور بہبودی کے لئے جپ تپ کروائے اور ہر سال جالندھر کے مشہور جیوتشی پنڈت آتمارام سے ورش پھل بنوا کر مخالف ستاروں کو خوش کرنے کی کوششیں کیں، ہر پورنماشی کو ستیہ نارائن کی کتھا کروائی شوہر کی درازیٔ عمر کے لئے سب برت رکھے وقت بے وقت خودداری کو چھوڑ کر اس کی مدد کی۔ اس کی وجہ سے چودہ برس تک اپنے باپ کی شکل نہ دیکھی (جنہوں نے ایک بار پنڈت شادی رام کی شان میں نامناسب الفاظ کا استعمال کیا تھا) اور دوسرے لوگ تو دور رہے کبھی اپنے لڑکوں سے بھی اپنے شوہر کی برائی نہیں سنی۔

یہ انسان

اپنی بیوی کی موت کے چوتھے روز جب شمشان سے پھول چننے کے بعد پنڈت پرسرام محلہ کی دھرمشالہ بیٹھے، تو ان کا دل دنیا اور دنیا کے تمام عیش و آرام کی طرف سے اداس تھا اس وقت ہی کیوں جب سے ان کی بیوی بیمار پڑی تھی اور جب سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ ڈاکٹروں، حکیموں اور ویدوں کی دوائیں اور ان کی ماں کے دیوی دیوتا اور پیر فقیر کوئی بھی اسے کالی موت کے منہ سے نہ بچا سکیں گے۔ جبھی سے ایک نامعلوم سا ویراگ ان کی نس نس میں سمایا جاتا تھا۔

علی الصبح کا اندھیرا ابھی کافی گہرا تھا۔ لوگ چپ چاپ آکر دری پر بیٹھ گئے تھے دھرم شالہ کے مندر کا پجاری بھی مندر کے چبوترے کو دھونے کا کام چھوڑ کر چپ چاپ

تعزیت کے لئے آبیٹھا تھا۔ پرے دروازے پر لالٹین اپنے آخری سانسوں کو زبردستی روک کر روشنی دینے کی سعی کر رہی تھی، تیل شاید ختم ہو چکا تھا، اور اس کی مدھم روشنی گویا تاریکی کی گہرائیوں کو اور بھی شدت سے ہویدا کر رہی تھی۔

پنڈت پرسرام نے ایک لمبا سانس لیا۔ ان کے دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ یہ تاریکی انہیں چپ چاپ نگل جائے، بالکل اسی طرح، جیسے موت کے اندھیرے نے ان کی بیوی کو نگل لیا تھا، ان کے کندھوں سے گرم کمبل کھسک کر دری پر آرہا تھا، قمیض کا گریبان کھلا تھا۔ لیکن تیر کی طرح جسم میں چبھنے والی سردی کا انہیں ذرہ بھر بھی علم نہ تھا۔ ان کے ہوش و حواس ہی گویا سُن ہو چکے تھے۔"

نائی نے کہا، "ججمان اٹھ کر ہاتھ دے دو" ۱؎

پنڈت پرسرام کمبل کو سنبھالتے ہوئے اٹھے، کھوتے کھوتے سے دھرم شالہ کے دروازے پر آکھڑے ہوئے اور انہوں نے سب کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

سب کو سنائی دینے والا ایک ٹھنڈا سانس لے کر اور عمر بھر کے تجربات سے دبی ہوئی کمر کو سنبھال کر لالہ رام بھایا اٹھے، اور ذرا نزدیک آکر بولے "دیکھو بیٹا! اب غم چھوڑ کر کچھ آئندہ کی فکر کرو، یہ سنسار تو اسی طرح چلتا رہتا ہے۔"

اس "آئندہ کی فکر" میں جو اشارہ پنہاں تھا، اسے سمجھ کر پنڈت پرسرام کا دل غصے سے بھر آیا۔ اور انہوں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

لالہ بھایا رام ایک سرد آہ بھر کر چل دیئے، اور ان کے بعد دوسرے لوگ ایک

۱؎ جب پھول چننے کے بعد لوگ آکر بیٹھتے ہیں، تو پھر انہیں اپنے اپنے گھر جانے کی درخواست کی جاتی ہے، جو خاموشی سے صرف ہاتھ بڑھا کر ہی دی جاتی ہے۔ اسے ہاتھ دینا کہتے ہیں۔

ایک کر کے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے، ان کے پاس سے گزرنے لگے۔

"بھائی موت کے سامنے کس کی پیش چلتی ہے۔ اپنے دل کو تسلی دو، اور اپنا گھر دوبارہ بساؤ۔"

"دنیا میں آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے، پنڈت جی! اس طرح دکھی ہو کر آدمی کہاں تک جی سکتا ہے؟"

"ماں کے بڑھاپے کا خیال کرو بھائی! اور کوئی ایسی سبیل کرو جس سے اسے بھی سہارا ملے۔"

"پنڈت جی ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔ اس عمر میں تو ہمیں کھانے پہننے کا بھی ہوش نہ تھا۔"

جب اظہارِ افسوس کے ساتھ ساتھ قریباً ہر ایک پڑوسی کے کچھ ایسے ہی فقرے ان کے کان میں پڑے تو پنڈت پرسرام کا غم اور بھی گہرا ہو گیا، اور غصے کا گولا سا دل سے اٹھ کر ان کے حلق میں اٹک گیا۔ لیکن وہ چپ چاپ نائی کے ساتھ مل کر دری لپیٹنے لگے۔ اس وقت ایک کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ نائی نے کہا۔

"وہ تو دیوی تھیں، دیا دھرم کا جو انہیں علم تھا کسے ہو گا۔۔۔"

اور پھر دری لپیٹتے لپیٹتے یہ دیکھ کر اس کی اس بات سے ججمان کے چہرے پر ایک سیاہ بادل سا ہو کر گزر گیا ہے، نائی نے کہا۔ "ان جیسی دیوی تو ججمان اب کہاں ملے گی، لیکن اگر آپ فرمائیں تو خوبصورت تعلیم یافتہ، گھر کے کام کاج میں۔۔۔"

پرسرام رو کھی ہنسی ہنسے اور "ہاں، ہاں، کیوں نہیں" کہتے ہوئے انہوں نے

کمبل کو لپیٹا، انگوچھے کو کندھے پر رکھا، اور گویا انگاروں پر سے گزرتے ہوئے گھر کو چل پڑے۔

دوپہر کو وہ اوپر چھت پر دھوپ میں آرام کرسی ڈالے پڑے تھے، اور صبح کی باتیں ایک ایک کرکے ان کے کانوں میں گونج رہی تھیں "آئندہ کی فکر کرو... اپنا گھر دیکھ لو... جب سے ماں کی ضعیفی کو سہارا ملے، ایسی سبیل کرو... ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے؟" اور وہ سوچ رہے تھے، یہ لوگ کتنے سنگدل ہیں! کسی کی ہڈیوں پر بیٹھ کر کس طرح شادی بیاہ کی باتیں کر سکتے ہیں، یہ دنیا کتنی خودغرض ہے؟ اور اس وقت انہوں نے سنا کہ سیڑھیوں پر ان کی ماں اپنے بڑھاپے کو، اور ان ختم نہ ہونے والی نگوڑی سیڑھیوں کو کوستی آ رہی ہے۔

جب ماں پاس آکر بیٹھ گئی اور اس نے سانس بھی ٹھیک کر لیا اور بیماری کے دنوں میں پرسرام نے بہو کی جو خدمت کی تھی اور جس طرح پیسہ پانی کی طرح بہایا تھا ان سب باتوں کا ذکر کرکے جب آخر میں دو آنسو بھی بہا لئے، تو کہنے لگی "دو بیٹا جو بنا ہے ایک دن ضرور ٹوٹے گا، دنیا میں اور کس چیز کو ثبات حاصل ہے، جو انسان ہی امر ہو جائے۔ جینا مرنا تو شروع سے اسی طرح ہوتا آیا ہے، اگر آدمی تمہاری طرح چپ ہو کر بیٹھ جائے، تو پھر سنسار کے کام کیسے چل سکتے ہیں"؛ اور پھر ایک سرد آہ بھر کر اس نے گلی بال ماتا والے پنڈت دین دیال کی چچی کا ذکر کیا کہ بے چاری بڑی بھلی ہے، جب سے شوہر نے وفات پائی ہے۔ اس نے کبھی اجلا کپڑا نہیں پہنا، اپنے من کو اس نے گھر کے کام کاج اور سادھو سنتوں کی خدمت میں لگا دیا ہے،

اور دھرم کرم کی تو گویا وہ مورت ہے اور پھر بولی۔ "وہ اس کا بھتیجا دین دیال بے حد شریف آدمی ہے۔ بجلی کی کمپنی میں ہیڈ کلرک ہے، دو سو تنخواہ پاتا ہے، اپنی چچی کا ماں کی طرح ادب کرتا ہے۔ اس بے چارے کا کوئی لڑکا نہیں، لے دے کے ایک ہی ہی لڑکی بھاگونتی ہے۔ جو اپنی نیک سیرت چچی کے قدموں میں بیٹھ کر گھر کے کام کاج اور دھرم کرم کے کاموں میں بالکل طاق ہو گئی ہے اور . . .

اس وقت پنڈت پرسرام کو آسمان میں کہیں سے کٹا ہوا پتنگ، بے بس سا، لاچار سا، ادھر ادھر ڈولتا، لحظہ بہ لحظہ نیچے گرتا دکھائی دیا۔ جدھر کو وہ جا رہا تھا ادھر ان کی نگاہ بھی جا رہی تھی۔ اور ان کی ماں یہ سمجھ کر کہ اس کا بیٹا ہمہ تن گوش ہو کر اس کی بات سن رہا ہے، مسرت بھرے لہجہ میں بھاگونتی کی صورت و سیرت کے گن گا رہی تھی، اچانک ایک جھپکی کھا کر پتنگ دور کسی مکان کے صحن میں جا گرا۔ پنڈت پرسرام نے لمبا سانس لیا، اس وقت ان کی ماں کہہ رہی تھی۔ "وہ بیٹا دین دیال کی چچی تو کہہ رہی تھی کہ اگر پرسرام مانے تو بھاگونتی . . ."

اچانک پنڈت پرسرام نے ان آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا جو سفید ہونے پر بھی آگ برسا رہی تھی اور ایک بار جیسے چیخ کر انہوں نے کہا، "ماں !!" . . . ساتھ ہی ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی ساس کا اداس غمگین چہرہ پھر گیا، ایک ایک کر کے سات بچوں کو موت کی گود میں سلا دینے کے بعد، کتنی منتوں اور مصیبتوں سے اس نے یہ ایک لڑکی پائی تھی، اسے اپنے خاوند کے ساتھ سکھی دیکھ کر وہ اپنے لڑکوں کی موت کو اپنے شوہر کی وفات کو اپنی کمی کو، اپنی اداسی کو، سب کو فراموش کئے ہوتے تھی، وہ اپنی اس لڑکی اور داماد کو دیکھ کر ہی زندہ تھی، اپنی ساس کے غم کا خیال

کر کے پرسرام کانپ اٹھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ ایک بار دھرم کا جو ناطہ قائم ہو گیا، اسے وہ ہرگز نہ ٹوٹنے دیں گے۔ وہ اسے تسلّی دیں گے، اسے کہیں گے۔ "اگر تمہاری لڑکی مر گئی تو کیا ہوا، تمہارا لڑکا تو موجود ہے۔ آخر داماد اور لڑکے میں فرق ہی کیا ہے۔" وہ اس کے پاؤں پر سر رکھ دیں گے اور کہیں گے۔ "ماں تمہارا یہ لڑکا تمہاری ہر خدمت کو تیار ہے!"

یہ سوچ کر وہ اٹھے۔ ان کی سسرال شہر ہی میں تھی، چپ چاپ ادھر کو چل پڑے۔

ان کی ساس، اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں پڑوسنوں کے دائرے میں بیٹھی اپنی نوجوان لڑکی کی وفات پر بین کر رہی تھی۔ اسے تو عمر بھر ہی رونا تھا لیکن سماج کا بھی یہ تقاضا ہے کہ گیارہ دن اسے دکھا کر رویا جائے۔ اس کے جاں سوز نالوں کو سن کر پرسرام کا دل بھر آیا، وہ چپ چاپ ڈیوڑھی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ رونا چند لمحوں کے لئے بند ہو گیا اور گزرنے کے لئے انہیں راستہ دے دیا گیا۔ ایک بڑھیا نے اسے پہچان کر گہری سرد آہ بھر کر کہا۔ "بے چارے کا اس گھر سے اتنا ہی ناطہ تھا اب صورت تک کو بھی ترس جائیں گے۔"

دوسری نے کہا۔ "بھلا یہ بھی کرنے کی بات ہے، بملا جو ہے۔" اور پھر پرسرام کی ساس سے اس نے کہا۔ "ستو کی ماں! اپنا تو جو جانا تھا چلا گیا، لیکن گھر کی آگ دوسرے کیوں کر سینکیں۔"

ستو کی ماں نے صرف ایک لمبی آہ بھری۔

پنڈت پرسرام کے کانوں میں بھی ان باتوں کی بھنک پڑ گئی۔ انہیں ان دونوں

کی جہالت پر رحم آیا۔ان کے دل پر جو گزر رہی تھی، ان کی ساس کے دل پر جو بیت رہی تھی اسے یہ عورتیں کیا جانیں؟

جب عورتوں کے چلے جانے کے بعد ساس ان کے پاس آئی، تو بیساختہ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے، لیکن ضبط سے کام لے کر جلد ہی بولی۔ ”صبح کا کا ہے کو کچھ کھایا ہوگا،“ اور پھر اس نے اپنے بھتیجے کی بہو کو بلا کر کہا کہ جلدی سے کچھ بنا دو۔ پرسرام نے بہتیرا کہا کہ مجھے کچھ بھوک نہیں، میں کچھ نہ کھا سکوں گا۔ لیکن جب ساس نے ایک لمبا سانس بھر کر اور غمگین انداز میں کہا۔ ”بیٹا اب تو کب میرے گھر کھانے گا۔“ تو پرسرام چپ ہو گئے۔ جس وقت کھانا تیار ہو گیا، تو بھوک نہ ہونے پر بھی وہ چپ چاپ کھانے لگے۔ ساس بھی پاس آ بیٹھی، اچانک اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں، گلا بھر آیا۔ گھٹے گھٹے لہجے میں بولی۔ ”قسمت میں اتنا ہی رشتہ تھا۔ میں تو تمہیں پا کر بے فکر ہو گئی تھی۔ لیکن جس بدھاتا نے اپنے ہی لڑکے چھین لیے وہ دوسرے . . .“

پرسرام نے نہایت حلیمی سے کہا۔ ”یہ کیا بات کرتی ہو ماں! یہ ناطہ اتنا کچا نہیں کہ موت سوُت کے تاگے کی طرح اسے توڑ دے۔“

”دنیا میں یہ ہوتا ہی آیا ہے بیٹا۔“ ساس نے جواب دیا۔

”دنیا! تم نے مجھے دنیا جیسا سمجھا ہے۔“

ساس نے کہا۔ ”بیٹا پرائی لڑکیاں تو آکر بھائی بھائی کو الگ کر دیتی ہیں۔ پھر میرا رشتہ تو اب کل کی بات ہو گئی۔“

”پرائی لڑکی؟ . . .“

ساس نے کہا۔ "ہاں، آخر پرائی لڑکی ہی تو آئے گی۔ تمہاری عمر ہی کیا ہے بٹیا۔"
اور پھر ایک سرد آہ بھر کر دبی آواز میں ساس نے کہا۔ "لوگ کہتے ہیں گھر کی آگ گھر ہی میں رہے، بملا ہے میرے جیٹھ کی لڑکی، تم نے اسے دیکھا ہوگا، چھوٹی ہی سی تھی۔ جب اپنے باپ کے پاس گیا چلی گئی تھی، لیکن اب تو بٹیا وہ شادی کے لائق ہے، اگر میرے کوئی اور لڑکی ہوتی تو کیا میں نہیں جانے دیتی لیکن اب یہی..."

"پرسرام نے کہا، "تم کہتی کیا ہو ماں؟"

"سوچتی ہوں، رشتہ ہو جائے، تو میرا بھی آنا جانا کھلا رہے۔ نہیں تو پرائی لڑکی کب..."

پرسرام کو غصہ آگیا، جل کر بولے "ماں نے یہ بات کہی، چچی نے یہ بات کہی، پاس پڑوس نے یہی بات کہی، کئی آنکھ کے اندھے سگائیاں لے کر بھی آئے، پر میں چپ رہا، لیکن تم، اس کی، مرنے والی کی ماں ہو کر یہی بات کہو گی۔ اور وہ بھی اس کی موت کے چوتھے دن ہی۔ اس بات کا خواب میں بھی مجھے خیال نہ آیا تھا۔" جذبات کی شدت سے پرسرام کا گلا بھر آیا۔ اسی وقت کسی نے آہستہ سے کہا۔ "نمسکار جیجا جی!"

پرسرام نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ نہایت خوبصورت لیکن اداس، بڑی بڑی آنکھیں لئے شرم کے بوجھ سے جیسے سمٹی ہوئی بملا، ان کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔

جوش اور غصہ میں پرسرام کچھ اور بھی کہنے والے تھے کہ رک گئے اور حیرت سے بملا کی طرف دیکھنے لگے۔

یہ وہی بملا ہے کیا، جسے انہوں نے آٹھ سال پہلے اپنی شادی کے دنوں میں بیٹھی

کتابیں اور کٹے بالوں کے ساتھ سکول جاتے دیکھا تھا۔

"پہچانا نہیں؟" ساس نے لمبا سانس لے کر کہا۔ "بملا ہے، تمہاری سالی"

پرسرام نے کہا "پہچانتا ہوں، اب تو یہ سیانی ہو گئی ہے۔"

اور بملا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

شام کو جب پنڈت پرسرام اپنی سسرال سے لوٹے تو ان کا دل اتنا اداس نہ تھا اس کے برعکس وہ خوش خوش تھے۔ رہ رہ کر ان کی آنکھوں کے سامنے بملا کی حسین و دلکش صورت پھر جاتی... چھی! چھی! کیا یہ مناسب ہے... وہ اپنے آپ پر جھنجھلاتے ہوئے جا رہے تھے لیکن وہ جتنا جھنجھلاتے، جتنا وہ اس تصویر کو دماغ کے پردے سے مٹانے کی کوشش کرتے، وہ اتنی ہی گہری ہو کر نقش ہوتی جاتی تھی، اور نادانستہ طور پر دل ہی دل میں وہ بملا کی خوبیوں اور خامیوں کا موازنہ کرنے لگتے۔

وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے پوچھا تھا "کہو بملا کیا کرتی رہیں، کچھ پڑھا بھی، یا یونہی وقت گنوایا۔" بملا نے کہا تھا "آٹھویں جماعت تک پڑھی ہوں۔ اس کے علاوہ میں نے وہاں اور بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ جیجا جی! چادروں میں ایسے ایسے پھول نکالتی ہوں کہ کون نکالے گا۔ دوسوتی کا کام نفیس سے نفیس سیکھ گئی ہوں۔ اتنے قسم کے سوئیٹر بُن لیتی ہوں کہ گنا بھی نہیں سکتی۔ اور پھر دھوتیوں کے کناروں سے ٹرنکوں کے غلاف بنا لیتی ہوں، پھٹے کپڑوں کے تاروں سے "نرم آسن" بُن لیتی ہوں اور کشیدہ...

اور پنڈت پرسرام سوچتے ایسی ہی بیوی تو میں چاہتا ہوں،" اور اس وقت اپنی مرحوم بیوی کی کئی خامیاں ان کی آنکھوں کے سامنے بھر جاتیں۔ وہ کہاں اتنی چست تھی، ان پڑھ اور گنوار اور اسے کب ان سب باتوں کا سلیقہ تھا... اس پر وہ اپنے آپ کو کوسنے لگتے۔ چھی! چھی!! کیا یہ مناسب ہے؟ ستّو سے بملا کا کیا مقابلہ، اس جیسی سادہ لوح، وسیع محبّت انہیں کون دے سکتا ہے؟ لیکن بملا!...

وہیں بیٹھے بیٹھے بملا کی بڑی بہن آگئی تھی، پرنم آنکھوں اور کانپتے ہوتے ہونٹوں سے اس نے پوچھا تھا۔ "جیجاجی ستّو کو کہاں چھوڑ آئے" اور وہ بلند آواز سے رونے لگی تھی۔ اس وقت اس کی یہ آہ وزاری پنڈت پرسرام کو بہت بری لگی تھی۔ اگرچہ کئی دن سے وہ اسی کے سہارے جی رہے تھے۔ اب اپنے گھر جاتے ہوئے، اپنے انہیں نامناسب خیالات پر انہیں غصّہ آرہا تھا، کیا ان کے لئے ایسا سوچنا مناسب تھا؟ کیا انہیں اس طرح کھوجانا نامناسب تھا؟ اپنی عزیز بیوی کی موت کے چوتھے دن ہی... چھی! چھی!!...

اس طرح اپنے آپ سے لڑتے جھگڑتے پنڈت پرسرام چلے جارہے تھے کہ راستہ میں ان کا دوست کندن مل گیا —— کندن —— وہ ہمیشہ خوش، ہمیشہ آزاد رہنے والا کنوارا!

"تمہاری بیوی مرگئی۔" اس نے ذرا سنجیدہ ہوکر کہا۔ "میں نے کل ہی سُنا" اور پھر ایک ہی سانس میں کہنے لگا۔ "دیکھو اب جلد ہی شادی کے پھندے میں نہ پھنسنا، کچھ دیر آرام کرنا"

پنڈت پرسرام کو یہ بات اچھی نہ لگی، بملا کی تصویر بجلی کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے کوند گئی۔ لمبا سانس لے کر انہوں نے کہا: "نہیں اب کیا شادی کروں گا۔"

کندن نے کہا: "ہاں، اب اس جنجال میں ہرگز نہ پھنسنا، پھر تم تو اس زندگی کا مزا بھی چکھ چکے ہو۔" اور وہ ہنسا۔

پنڈت پرسرام کو یہ دوسرا زخم لگا۔ لیکن دل کے جذبات کو دل ہی دل میں دبا کر کچھ دبی آواز میں انہوں نے کہا: "نہیں اب شادی کیا کروں گا۔" اور پھر جیسے خلا میں دیکھتے ہوئے بولے: "میری ساس میری سالی کے لئے کہہ رہی ہے۔ اس کے کوئی لڑکی بھی نہیں، چاہتی ہے وہاں ناطہ کر لوں تو اس کا آنا جانا بھی کھلا رہے اور پھر اچانک جوش سے کہنے لگے۔ "لیکن میں تو شادی کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا بسنتو کی موت کے بعد۔۔۔"

"ہاں، ہاں، کبھی نہ پھنسنا۔ بالکل نہ پھنسنا آسمان میں اُڑنے والے پرندے کی طرح آزاد۔۔۔" اور کندن یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ پنڈت جی پریشان ہو کر کچھ دیر وہیں کھڑے رہے۔ ایک گہری طنز کی طرح چتین کے یہ الفاظ ان کے کانوں میں گونجنے لگے۔

رات کو کھانا کھاتے وقت ماں نے گلی بال ماتا والے پنڈت دین دیال کی بچی کی بات چھیڑی تو وہ خاموشی سے سُنتے رہے، انہیں ایسا معلوم ہوا گویا چتین کی باتوں سے ان کے دل پر جو گھاؤ لگے تھے، ماں کی باتیں ان پر ٹھنڈے مرہم کا کام دے رہی ہیں۔

صبح اٹھے تو پنڈت پرسرام کا سر بھاری تھا۔ وہ رات بہت دیر تک سو نہ سکے تھے۔

ساری رات ان کے دل میں ایک کشمکش جاری رہی تھی۔ اور صبح اٹھنے کے ساتھ ہی سسرال جانے کی ایک زبردست خواہش ان کے دل میں جاگ اٹھی تھی۔ ساری رات بملا کی حسین، دلکش بھولی بھالی صورت ان کی آنکھوں میں گھومتی رہی تھی۔ جلد جلد رفع حاجات سے فارغ ہو، نہا دھو، کپڑے پہن کر وہ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ چلتے وقت دروازے کے اوپر ٹنگی ہوئی اپنی مرحوم بیوی کی تصویر پر ان کی نظر رُک گئی۔ وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے چوری کرنے کے لئے جاتے وقت ان کا پاؤں کسی نے پیچھے سے پکڑ لیا ہے۔ اپنا یہ کردار بھیانک صورت اختیار کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ انہوں نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیا اور کرسی میں دھنس گئے۔

اس کے بعد کئی دن تک اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے۔ ان کے دل میں کشمکش ختم ہو گئی ہو۔ یہ بات نہ تھی لیکن انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے ختم کر دیں گے۔

ان سات دنوں میں کئی اچھے اچھے گھروں سے پیغام بھی آئے۔ لیکن پرسرام اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکلے۔ ماں کے پاس بھی نہیں بیٹھے کہ کہیں گلی بال ماتا والے پنڈت دین دیال کی بچی اور ان کی بھتیجی کا ذکر نہ لے بیٹھیں۔

جب کریاکرم کے دن ان کی ساس اور بڑی سالی اظہار افسوس کے لئے

آئیں تو بملا بھی ان کے ساتھ تھی۔ اس وقت بھی پنڈت پرسرام سامنے نہ آسکے۔ گویا کرم سے نپٹ کر بھی اوپر کے اپنے کمرے میں جا بیٹھے۔ جا تو بیٹھے، لیکن جیسے وہاں سے اٹھ کر باہر جانے کے لئے ان کا دل بے تاب ہو گیا۔ بملا آئی ہوئی ہے۔ یہ بات وہ بھول نہ سکے۔ رہ رہ کر ان کا دل اٹھ کر کھڑکی میں جا بیٹھنے کے لئے نظر بھر بملا کو دیکھ لینے کے لئے بے چین ہوا جاتا۔ انہوں نے اپنے دل کو ضبط میں رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کی مرحوم بیوی کی تصویر اب بھی وہیں ٹنگی تھی، اسے دیکھ کر انہوں نے اپنے آپ کو کوسا بھی، لیکن ان سب باتوں کے باوجود جب انہوں نے سنا کہ وہ سب جا رہی ہیں تو وہ کھڑکی میں جا کھڑے ہو گئے۔ اس وقت اچانک بملا نے ادھر دیکھا، اور لمحہ بھر کے لئے ان کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

جب وہ دور نکل گئیں، تو انہوں نے کھڑکی بند کر لی، جا کر آرام کرسی پر لیٹ گئے۔ پھر رد عمل شروع ہوا۔ وہ آرام کرسی پر لیٹے لیٹے، آنکھیں بند کر کے تصور کے خوبصورت، دلکش نظاروں کی سیر میں محو ہو گئے۔ جہاں اس کی مسکراہٹ کی سنہری آرام دہ دھوپ کھلتی تھی۔ اس کے معطر بالوں کے لمس سے مخمور ہو کر ہوا جھومتی تھی اور اس کی ملاحت بار آواز کے تال پر ندی چھل، چھل، چھل، چھل بہتی تھی۔ بملا: بملا ۰۰۰ وہ اس سے شادی کر لیں گے۔

اس وقت کسی نے کہا، سنو! اور انہوں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، سامنے دیوار پر ان کی مرحوم بیوی کی تصویر آویزاں تھی، انہیں محسوس ہوا جیسے یہ آواز وہیں سے آئی ہے۔ دل دھک دھک کرنے لگا، پریشان ہو کر وہ ادھر دیکھتے رہے، پھر اچانک جیسے کوئی زبردست فیصلہ کر کے اٹھے، دروازہ آہستہ سے بند

کر دیا، اور چٹخنی لگا دی، میز کو گھسیٹ کر دروازے کے پاس لے آئے۔ اس پر کرسی رکھی، اس کے اوپر چڑھے اور تصویر کو اتار لیا۔

کمرے میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ روشن دان کے شیشوں سے آنے والی مدھم روشنی میں ان کی نظر دائیں جانب لگے ہوئے قد آدم شیشے پر گئی اور اس وقت انہیں اپنا عکس ایک خوفناک عفریت کی طرح دکھائی دیا۔ بڑھ کر انہوں نے ایک اخبار اٹھایا۔ تصویر کو اس میں بند کیا اور اندر کوٹھڑی میں جا کر چار ٹرنکوں کو اٹھا کر نیچے کے بڑے ٹرنک میں اسے رکھ آئے۔ میز کو کھسکا کر اپنی جگہ کر دیا، کرسی اتار لی، اور دروازہ کھول کر بجلی کا بٹن دبا دیا۔ اور پھر کرسی پر لیٹ گئے۔

رات کو کھانا کھاتے وقت انہوں نے خود ہی شادی کی بات چھیڑ دی۔

ماں کا چہرہ کھل گیا، لگی ہاں ناناوالے پنڈت دین دیال کی بچی کی بات انہوں نے پھر چلائی کہنے لگیں۔ "بیٹا! وہ تو آج بھی آئی تھی۔ بھاگونتی لڑکی تو ایسی سمجھدار ہے کہ کیا کہوں، تو جا کر ایک نظر دیکھ تو آ۔"

لیکن پریمرام کی آنکھوں میں تو اس وقت بملا بیٹھی تھی، خوبصورت شوخ آنکھیں حیا کے پردے میں لپٹے رہنے پر بھی جیسے انہیں بلا رہی تھیں، اور ماں کہہ رہی تھی۔۔۔

"بیٹا! رنڈوے کے تو اڑھائی پٹ ہوتے ہیں۔ رواج ہی ایسا ہے لوگ دو اڑھائی مہینے تک تو آتے ہیں۔ پھر کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تو کنوارا رہے گا، لیکن اچھے گھر والے تو پوچھ پوچھ کر ہار جائیں گے۔"

اپنے تصور میں محو پریمرام سنتے رہے جیسے بملا انہیں بلا رہی ہے۔ انہیں کہہ رہی

ہے۔" جیجاجی! تمہارے لئے ہی تو میں اتنی دور سے آتی ہوں، اتنی دور سے ــــ گیا سے ...." اور ماں کہہ رہی تھیں۔" تم ہاں کر دو بیٹا، تو میں کل ہی دین دیال کی چچی کو بلوا لوں" پرسرام نے جیسے اپنے آپ سے "ہوں" کہا، ماں نے سمجھا کہ اس کے بیٹے کو اب عقل آ گئی ہے اور بیٹے نے سمجھا کہ گیا سے چل کر آنے والی اس سیم تن بلانے اسے بلایا ہے اور وہ اس سے ضرور ملنے جاتے گا۔

چنانچہ دوسرے دن جب ان کی ماں گھر کے کام کاج سے چھٹی پا کر گلی بال ماتا کی طرف جا رہی تھی، پنڈت پرسرام ایک نہایت نفیس، صوفیانہ سوٹ زیب تن کر کے اپنے سسرال کی طرف رواں دواں تھے۔

دسمبر کا مہینہ تھا اور آسمان کھلا ہوا تھا، سورج جو صبح کے وقت کنجوس کی طرح اپنی دولت کو چھپائے ہوئے تھا، اب دونوں ہاتھوں سے اسے لٹا رہا تھا۔ بڑے دنوں کی چھٹیوں کی وجہ سے لاہور میں ایک خاص چہل پہل تھی۔ غم کو جیسے دبا کر، درد کو جیسے بھلا کر، اور مفلسی کو جیسے چھپا کر لوگ خوش خوش گھوم رہے تھے۔ پنڈت پرسرام کو ہر طرف تروتازگی محسوس ہو رہی تھی، اور ان کا دل آسمان کی بلندیوں میں اڑنے والی چیلوں کی طرح پنکھ پھیلا کر آسمان میں اڑ جانا چاہتا تھا، ان کا دماغ مسرت کی ایک نئی سلطنت بنا رہا تھا۔ جس کے راجا وہ خود تھے، اور رانی ننھی حسین، نازک اندام بملا...

اور ان کی سسرال آ گئی۔

ان کی ساس آنگن میں بیٹھی سوت کات رہی تھی۔ وہ چپ چاپ اس کے پاس

جا کر بیٹھ گئے۔ ایک بار اس اس نے پوچھا۔ "کہو اچھے ہو؟" اور جب انہوں نے کہہ دیا کہ آپ کی مہربانی ہے، تو پھر خاموشی سے وہ سوت کاتنے لگی۔

پانچ منٹ بیتے۔ دس منٹ بیتے، پندرہ منٹ بیتے۔ پرسرام کے لئے یہ ماحول ناقابل برداشت ہو گیا، کھسیانے سے ہو کر انہوں نے پوچھا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

جواب میں ساس نے صرف ایک سرد آہ بھری۔

پنڈت پرسرام کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ آخر یوں بیٹھے بیٹھے کیا کریں؟ ساس کے منہ کی طرف تاکتے رہیں۔ وہ کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکے، ہار کر انہوں نے پوچھا —— "وہ سب لوگ کدھر ہیں؟"

"کریا کے بعد اپنے گھر چلے گئے۔"

مصنوعی حیرت سے پرسرام نے پوچھا۔ "وہ گیا؟"

"نہیں" ساس نے کہا۔ "ابھی گیا کیوں کر جا سکتے ہیں۔ بملا کی شادی کر کے ہی جا ہیں گے۔"

"تو کہاں سگائی کی؟" پرسرام نے جیسے بے پروائی سے پوچھا۔

"یہیں شہر میں کی ہے۔ آج ہی شگن دے کر آتے ہیں، تم تو مانتے ہی نہیں اور ان کو واپس بھی جانا ہے۔"

شہیدوں کی طرح پرسرام نے کہا۔ "میں کیسے مان جاتا، سیٹھ دتی کی موت کے بعد اتنی جلدی . . .

ساس بولی۔ "انہوں نے مجھ سے اصرار کیا تھا، لیکن میں نے کہہ دیا، بھائی اس کے دل پر چوٹ لگی ہے۔ وہ نہ مانے گا۔ اتنی جلدی . . ."

پرسرام نے دل میں جیسے روتے ہوئے کہا۔ "اچھا کیا، اچھا کیا" اور پرنام کر کے ساس سے چھٹی لی اور اٹھ آئے۔

گھر پہنچ کر کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر چڑھ گئے۔ ماں اوپر صحن میں بیٹھی مٹروں سے دانے نکال رہی تھی۔ انہیں آتے دیکھ کر شکایت بھرے لہجے میں بولی۔ "بیٹا تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی۔ گلی بال ماتا والے پنڈت دین دیال اور ان کی بچی ۔ ۔ ۔ ۔"

پنڈت پرسرام نے گرج کر کہا۔ "کیا تم پاگل ہو گئی ہو، اگر ستو تمہاری لڑکی ہوتی، تو کیا تمہیں اپنے داماد کا اتنی جلدی شادی کر لینا اچھا لگتا ۔ ۔" اور دھم دھم قدم رکھتے ہوئے اندر اپنے کمرے میں جا کر سوٹ سمیت ہی بستر پر لیٹ گئے۔

مٹر کی پھلی ماں کے ہاتھ سے گر پڑی اور وہ حیران سی، بھونچکی سی ان کے پیچھے خلا میں دیکھتی رہ گئی۔

کھلونے

صبح کی دھندلی روشنی جب آس پاس کے اونچے سہ منزلے مکانوں کو پار کر کے احاطے میں سے ہوتی ہوئی اس کی تاریک کوٹھڑی تک آئی تو بوڑھے کھلونے والے نے آنکھیں کھولیں —— صبح کے جھٹپٹے میں اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے کھلونوں کے بے ترتیب ڈھیر سمندر کی سطح سے آہستہ آہستہ ابھرتی ہوئی چٹانوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ اپنے لرزاں ہاتھ کو دھرتی پر ٹیک کر وہ اٹھ بیٹھا۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے ضعف کے باعث کانپتے کانپتے، اس نے کمر کے میلے کالے انگرچھے کو ٹھیک کیا —— جس میں کئی پیوند لگے ہوئے تھے، اور جس کا رنگ میل کے باعث اس کے جسم کی سیاہی سے مل گیا تھا —— جو خود کوٹھڑی کی کالک کا ایک جزو معلوم ہوتا تھا —— اپنی نیم اندھی آنکھوں سے ٹٹول کر اس نے پاس پڑی لٹھیا اٹھائی اور اس کے سہارے اٹھ

کھڑا ہوا۔

کوٹھڑی کی چوکھٹ میں ایک لمحہ کے لئے رُک کر بوڑھے کھلونے والے نے اپنی مٹیالی، بے نور سی پتلیوں سے احاطے کا جائزہ لیا۔ یہاں کوٹھڑی سے بھی زیادہ ویرانی چھائی ہوئی تھی —— پرے کونے میں بھٹی کھڑی تھی۔ بے رونق اور پژمردہ —— کثرتِ اولاد کی ماری بیمار اور زرد رُو ماں کی طرح —— اس ایک مہینے کے اندر اندر نہ جانے اس نے کتنے جھول اتارے تھے۔ پاس ہی پکے سرخ لیکن ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کا ڈھیر لگا تھا۔ بائیں طرف چکنی مٹی کا تغار تھا۔ جس کی سطح سوکھ کر تڑخ گئی تھی —— اور باقی سارے احاطے میں وہ سب کھلونے بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ جنہیں اس کا چھوٹا بیٹا روپ اور اس کی بہو کملا دن رات کی محنت شاقہ کے باوجود تیار نہ کر سکے تھے —— کر بھی کیسے سکتے ؟ روپ تو میلے سے کئی دن پہلے دو کانوں کے نیلام پر بھائیوں سے لڑ لڑا کر، ہاتھ پیر تڑوا کر آبیٹھا تھا۔ کتنا سمجھایا تھا اس نے کہ بیٹا تو سب سے چھوٹا ہے۔ تجھے چھوٹا بن کر رہنا چاہیئے۔ بڑے بھائیوں کے منہ نہ آنا چاہیئے۔ وہ برے سہی لیکن تو کیوں بُرا بنتا ہے ؟ لیکن اس کی کون سنتا ! اسے تو سب بے وقوف ناکارہ اور اپاہج سمجھتے تھے۔

وہیں چوکھٹ میں کھڑے کھڑے اس نے دیکھا فوجیوں کی ایک لمبی قطار رنگی ہوئی کھڑی ہے لیکن اس پر روغن نہیں ہو سکا۔ ایک طرف گھونسلے بنے رکھے ہیں چڑیوں کا بھی ڈھیر لگا ہے۔ لیکن انہیں گھونسلوں میں بٹھایا نہیں جا سکا۔ بندر اور وہ ننھے جن پر انہیں قلابازی لگانا تھی۔ دونوں گڈمڈ پڑے ہیں۔ اور پھر آموں، رنگتروں، ناشپاتیوں لوکاٹوں، سیبوں، انگوروں، مکئی کے بھٹوں اور باجرے کے سٹوں کے ڈھیر کے ڈھیر

پڑے ہیں ——— اس کے دل کی گہرائی سے ایک لمبا سانس نکل گیا۔ اور پھر لٹھیا کے سہارے
وہ کانپتا کانپتا باہر کی طرف چل پڑا۔

دروازے کے برابر نمائشی کھلونے رکھے تھے۔ روپ ان میں سے چند ہی مکمل کر
کے ساتھ لے جا پایا تھا اور باقی سب نامکمل پڑے تھے ——— درخت کے تنے کا
ایک حصہ تھا جس کی کھوہ کے دہانے پر ایک طوطا بیٹھا تھا اور دوسرا داخل ہو رہا
تھا۔ ہرنوں کی ایک سندر جوڑی تھی ——— کان اٹھاتے گردن نیہوڑاتے، چوکنی اور
چست۔ ایک پری تھی ——— پر پھیلاتے ہوئے مائل بہ پرواز ——— اپنی پتھرائی ہوئی
سی آنکھوں سے بوڑھے نے جھک کر ان سب کھلونوں کو دیکھا ——— اگرچہ اس کے
بنائے ہوئے سانچوں سے اتارے گئے تھے۔ لیکن ہاتھ کی صفائی اور رنگ و روغن کی
وہ کاریگری کہاں ان میں سے ہر ایک وہ دس دس بیس بیس میں بیچ آتا تھا۔ لیکن اب
وہ بھی کوڑیوں کے مول بکتے تھے ——— اس کے یہ بیٹے ——— انہیں بھی وہ اپنے کھلونے
ہی سمجھا کرتا تھا ——— لیکن اب تو ان سب نے اسے کھلونا سمجھ رکھا تھا ——— بے حس
بے جان سا کھلونا ——— اور ماتھے کو ٹھونک کر اس نے دروازے کو تالا لگا دیا۔

پڑوسی بنئے کی حویلی کے سامنے باجا بج رہا تھا۔ شاید بنیا اپنے پہلوٹھی کے بچے کو
لے کر بابا سوڈل کی منت پوری کرنے جا رہا تھا ——— سوڈل بابا دودھ پوت کے داتا جو
ہیں ——— جب اس کے گھر کوئی اولاد نہ ہوتی تھی تو اس نے بھی بابا سوڈل کی منت مانی
تھی کہ جب اس کے گھر بچہ ہوگا تو وہ اسے لے کر باجے گاجے کے ساتھ سوڈل بابا کی
خدمت میں حاضر ہوگا اور جب اس کے گھر جگو ہوا تو نیلے سے گیارہ دن پہلے اس نے
خود چار پیالوں میں گیہوں بوتے تھے۔ روز دو وقت تازہ پاکیزہ جل سے انہیں سینچا تھا

اور یہ دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سمایا تھا کہ پڑوسیوں کے پپایوں کی پیلی زرد پود کے مقابلے میں اس کے پپایوں کے پودے گہرے ہرے رنگ کے ہیں اور دو دو بالشت لمبے ہیں۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ سوڈل بابا اس پر خوش ہیں۔ سوڈل کی پوجا کے لئے مٹھریاں بنانے کی غرض سے وہ بے حد اچھے گیہوں لایا تھا ـــ موٹے موٹے اور شہرتی رنگ کے ـــ چھاج میں پھٹک کر اور پانی میں بھگو کر اس نے انہیں سب آلائشوں سے پاک کیا تھا۔ اور پھر گیارہ دن انہیں دھوپ میں سکھایا تھا۔ اس تمام عرصے میں وہ خود ان کی رکھوالی کرتا رہا تھا۔ تاکہ دیوتا کے چرنوں میں چڑھنے سے پہلے کوئی چڑیا انہیں جھوٹھا نہ کر جائے۔ میلے کی پہلی رات کو اس نے خود اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھ کر مٹھریاں تلی تھیں اور پانچ بڑیاں بنائی تھیں اور میلے کی صبح وہ دونوں ہاتھوں میں پوجا کی تھالی اور گیہوں پیالے تھامے۔ وہ باجے کے پیچھے پیچھے اپنے بیوی اور بچے کے ساتھ روانہ ہوا تھا تو دودھ اور پوت دینے والے بابا سوڈل کے لئے اس کا من عقیدت سے بھر گیا تھا۔

اس دن کی یاد آتے ہی اس کے سامنے ایک سیاہ رنگ کے مریض نوجوان کی صورت پھر گئی ـــ تیلے تیلے ہاتھ پاؤں اور تلی کے باعث بڑھا ہوا پیٹ۔ یہ جگو تھا ـــ اس کا پہلوٹھی کا لڑکا ـــ جس کے جنم پر وہ باجے گاجے کے ساتھ سوڈل کے میلے پر گیا تھا۔ جس کے جنم کے ساتھ ہی اس کے دل میں رنگین تصورات نے جنم لیا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ اس کے تصور بھی جگو ہی کی طرح بیمار، زرد اور بے ڈھنگے ہو گئے تھے۔

اس نے بابا سوڈل کی خوب منتیں مانی تھیں۔ اور بڑی عقیدت سے ہر سال

ان کی پوجا کرتا رہا تھا۔ اور بابا سوڈل نے بھی دودھ اور پوت سے اس کی گود بھری تھی —— جگو کے بعد پے در پے اس کے اور تین لڑکے ہوتے تھے —— سندری ہری اور روپ —— بابا سوڈل ہیں بھی تو دودھ اور پوت کے داتا۔ لیکن ان کا کام صرف دودھ اور پوت دینا ہے۔ باقی زندگی سے انہیں کوئی سروکار نہیں —— بعد میں دودھ چاہے پھٹ جائے اور پوت خواہ کپوت ہو جائیں۔

دودھ پھٹ گیا تھا اور پوت کپوت ہو گئے تھے اور اپنے بھاگ کو کوستا فکر اور اندیشے سے چور، بھیڑ سے بچتا بچاتا، ضعف کے باعث ہانپتا کانپتا لٹھیا کے سہارے چلا جا رہا تھا —— اس کے سامنے ایک طوفان امڈا آ رہا تھا اور وہ محسوس کرتا تھا جیسے یہ طوفان اس کاشانے کے آخری تنکے تک بکھیر کر رکھ دے گا۔ اور وہ چاہتا تھا کہ وہ اڑ کر وہاں پہنچ جائے اور پنکھ پھیلائے، سینہ تانے اس طوفان کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ اپنے گھونسلے کو بچالے۔ اپنے بچوں کو بچالے —— لیکن اس کی حالت اس پرندے کی سی تھی جس کے پروں میں اتنی بھی سکت نہ ہو کہ وہ پوری طرح پھیل سکیں۔

چاروں بھائیوں کی دکانیں زمین کے ایک ہی قطعے پر ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھیں پہلے اس قطعے پر صرف ایک دکان لگتی تھی پھر دو لگنے لگیں۔ پھر تین ہوئیں اور اب تھیں چار —— بظاہر اب بھی وہاں ایک ہی دکان لگی ہوئی معلوم ہوتی تھیں لیکن دراصل روپ اور اس کے بھائیوں کی دکانوں میں ایک نظر نہ آنے والی خلیج حائل تھی۔

صبح ادھر لوگ باباسوڈل کے درشنوں کو آنے لگے۔ ادھر چاروں بھائیوں میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ سوڈل کے عقیدت مند بڑے دروازے سے آتے اور تالاب کے پاس بیٹھے ہوئے پجاری کے سامنے پوجا کے لئے لاتی ہوئی مٹھڑیاں ڈھیری کر کے پاپوں کو تالاب کی سیڑھیوں پر پھینک کر اشنان کرتے۔ پھر اپنے پتروں کو پانی چڑھاتے اور ایک ایک پتر کا نام لے کر گیارہ گیارہ بار تالاب کی مٹی نکالتے۔ اس کے بعد کپڑے پہن کر بال بچوں کو لئے ہوئے سوڈل بابا کے مندر کا طواف کرتے اور پھر خوانچہ فروشوں کی بے شمار دکانوں سے کھاتے اور بچوں کو کھلاتے ہوئے کھلونوں کی ان چاروں دکانوں کے آگے سے گزرتے۔ کیوں کہ وہ واپس جانے کا دروازہ ان کی دکانوں کے عقب میں تھا۔

روپ کی دکان سب سے آگے تھی، اس کے بعد ہری کی پھر سندری کی اور پھر جگو کی۔ روپ کی چوٹیں ابھی تک ٹھیک نہ ہوئی تھیں۔ وہ کمزور بھی تھا۔ اس لئے چپ چاپ گدی پر بیٹھا تھا۔ اس کے محلے کے ایک دو لڑکے (صرف شغل کے طور پر) اور ایک دو نوجوان (محض دیدار بازی کے لئے) اس کے کام میں ہاتھ بٹا رہے تھے! مہینوں گھر کی چار دیواری میں بندھی نوخیز لڑکیاں میلے میں آزاد ہرنیوں سی پھر رہی تھیں۔ اور اس کھلے حسن کا نظارہ کرنے کے لئے کھلونوں کی ان دکانوں سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی ــــــ میلے سے واپس جاتے ہوئے لوگ انہی دکانوں کے آگے سے ہو کر گزرتے۔ ان میں سے بیشتر کھلونے خریدتے تھے ــــــ تب کھلونے لیتے وقت کبھی نوخیز لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینا یا کبھی کے سیمیں ہاتھوں پر مخروطی انگلیوں کو چھونے کی مسرت حاصل کر لینا کچھ مشکل نہ تھا ــــــ اور وہ سب بڑے

شوق سے کھلونے بیچ رہے تھے۔

جوں جوں روپ کے کھلونے زیادہ بکتے ہری اور سندری کے دل میں غبار سا اُٹھتا ـــــ حسد کا غبار ـــــ رہا جگو، تو وہ حسد کے قابل ہی نہ تھا۔ اپنے پھولے ہوتے پیٹ، نحیف و نزار جسم لکڑیوں سے ہاتھ پاؤں کو لئے ہوتے وہ بھیگی ہوئی مٹی کی طرح پڑا تھا ـــــ اچانک ہری ایک سٹول پر کھڑا ہو گیا اور آوازیں دے کر کھلونے بیچنے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی سندری بھی اٹھا۔ لیکن روپ کی دکان پر ایک کی بجائے دو لڑکے کھڑے ہو گئے۔

فتح کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ روپ کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اس کے جلتے ہوئے دل کو لمحہ بھر کے لئے تسکین ملی۔ اس دکان کے لئے اس نے باقی بھائیوں سے چھ روپے زیادہ دیئے تھے۔ ہاتھ پیر تڑواتے تھے۔ سات دن تک اپاہج سا پڑا رہا تھا۔ لیکن اس کامیابی کو دیکھ کر اسے جیسے ان سب تکلیفوں کا اجر مل گیا ـــــ کاش وہ سارے کھلونے مکمل کر سکتا۔

جگو اور سندری کی نسبت اسے دراصل ہری پر غصہ تھا۔ جگو اگرچہ سب سے پہلے الگ ہوا تھا۔ لیکن اس علیحدگی سے آپس میں کسی طرح کے مقابلے کی بنا نہ پڑی تھی اور جب سندری اپنی بیوی کو لے کر الگ ہو گیا تھا تو بھی کنبے آپس میں ملتے تھے اور دکانیں ایک ہی قطعے پر لگتی تھیں۔ لیکن ہری کی علیحدگی نے تو ان کے درمیان ایک غیر مرئی خلیج حائل کر دی تھی ـــــ وہ کچھ ایسی شاطرانہ چالیں چلتا کہ روپ اس سے عاجز آ گیا تھا ـــــ دونوں بڑے بھائیوں کی علیحدگی کے بعد روپ اور ہری مل کر کام کرتے تھے۔ اپنی شادیوں پر دونوں نے قرض لے رکھا تھا۔ ہری نے روپ سے

کہا تھا۔۔۔۔ "ہم دونوں مل کر اس قرضے کو اتار دیں گے۔ پہلے تم میرے ساتھ مل کر میرا قرض اتار دو۔ پھر میں تمہارے ساتھ مل کر تمہارا قرض اتار دوں گا۔ اور جب دن رات محنت کر کے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں دوگنے کھلونے تیار کر کے روپ اور کملا نے ہری کا قرض اتار دیا تھا اور روپ کا قرض اتارنے کی باری آئی تھی تو ہری الگ ہو گیا تھا۔ یہی نہیں اس نے روپ کے خلاف باقی بھائیوں کو بھڑکایا اور تینوں نے مل کر اس کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا تھا۔

روپ کے دل میں بگولا سا اٹھا اور اس نے قہر آلود نگاہوں سے ہری کی طرف دیکھا۔ اس نے کھلونوں کی قیمتیں سستی کر دی تھیں۔ کڑک کر روپ نے اپنے آدمیوں سے کہا۔۔۔ "اکنی والی چیزوں کے دو دو پیسے کر دو۔" اور لڑکوں نے پوری زور سے آواز لگائی۔۔۔ "اکنی والے کھلونے دو دو پیسے میں" "اکنی والے کھلونے دو دو پیسے میں۔"

کاش وہ سارے کے سارے کھلونے مکمل کر پاتا۔۔۔ دیوالی، دسہرہ، ٹھنڈی باجرے۔ سب میلوں پر اس کے بھائیوں نے اس کے خلاف دکان لگائی تھی لیکن کچھ اپنی محنت اور کچھ پڑوسیوں کی رفاقت کے باعث وہ اپنے بھائیوں سے بازی لے گیا تھا۔ ایک میلے کے ختم ہونے کے بعد ہی وہ اور کملا دوسرے کی تیاری شروع کر دیتے۔ بسنت پنچمی کے میلے میں اس کے بھائیوں نے کھلونوں کی قیمتیں سستی کر دی تھیں، اس لئے وہ سوڈل کے لئے اتنے کھلونے تیار کر لینا چاہتے تھے کہ اگر اکنی والے کھلونے پیسے پیسے کو بھی فروخت کرنے پڑیں تو وہ ان سے بازی لے جائیں اور دن رات محنت کر کے انہوں نے بے شمار کھلونے تیار کر لئے تھے۔۔۔ بسنت پنچمی

کے بعد ہی وہ اور کملا ایک اندھی ضد کے زیر اثر سوڈل کے میلے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ رات کے پچھلے پہر اٹھ کر لیمپ کی مدھم روشنی میں وہ مٹی اور سانچے لے بیٹھتے اور سارا سارا دن کھلونے بنانے میں مصروف رہتے۔ جب بھوک لگتی کچھ روکھی سوکھی کھا کر پھر کام میں جٹ جاتے۔ بیٹھے بیٹھے تھک جاتے تو روپ اٹھ کر نئے کھلونوں کے لئے مٹی کا تغار بنانے لگتا اور کملا دھوپ میں سوکھے ہوئے کھلونوں کو بھٹی کے پاس لا رکھتی۔ وہ مٹی تیار کر لیتا تو کمانے لگتی۔ اس طرح تھکے ہوئے اعضا کچھ کھل جاتے تو پھر دونوں سانچے لے بیٹھتے۔ شام کی ضیافت بھنے ہوئے چنوں سے ہو جاتی۔ ساتھ ساتھ کام ہوتا ساتھ پیٹ کو باندھ دیا جاتا۔ دن چڑھتا ڈھلتا اور ختم ہوتا۔ لیکن وہ اسی تندہی سے اپنے کام میں محو رہتے۔ رات کا ایک ایک بج جاتا اور ان کی سرگرمی میں کمی نہ آتی۔ ان کے ہاتھ اسی تیزی سے چلتے۔ کھلونوں سے فالتو مٹی اسی تیزی سے تراشی جاتی۔ سوکھے ہوئے کھلونوں پر صفائی کے لئے پانی کا ہاتھ اسی تیزی سے پھیرا جاتا ——— اور انہوں نے اتنے کھلونے بنا لئے تھے کہ اگر وہ سب مکمل ہو جاتے تو روپ اپنے بھائیوں کو ایسی زک دیتا . . ایسی زک دیتا . . چاہے پھر وہ اکنی کا کھلونا ایک ایک دھیلے میں بیچتے ——— لیکن یہ اس کے ظالم بھائی ——— قطعوں کے نیلام پر انہوں نے اسے بڑی طرح زد و کوب کیا تھا۔ بات یہ تھی کہ جہاں پہلے سب بھائی مل کر ایک قطعہ آٹھ روپیہ کو لے لیتے وہاں اب اسی ایک قطعے کے چار ٹکڑے کئے گئے تھے۔ روپ کے بھائی چاہتے تھے کہ کہ سب سے آخری ٹکڑہ روپ کو دیا جائے۔ کیونکہ وہ سب سے چھوٹا ہے لیکن سب سے آخر میں جگہ پانے کا مطلب تھا کہ اس کا ایک کھلونا بھی نہ بکتا۔ اس کے یہ "ہمدرد" بھائی کب

کسی گاہک کو اس تک پہنچنے دیتے۔ اس لئے وہ اڑ گیا تھا۔ ”گا تو پہلا ٹکڑا ہی لیگا۔“
اور اس پر ان چاروں ٹکڑوں میں سے پہلے کا نیلام ہوا تھا۔ جہاں سارا قطعہ آٹھ
کو بکتا وہاں اس کا چوتھا حصہ روپ نے آٹھ روپے کو لے لیا اور اگرچہ باقی کسی
ٹکڑے کی بولی نہ ہوئی تھی اور اس کے بھائیوں نے باقی تینوں ٹکڑے چھ روپے کو لے
لئے۔ لیکن پہلے ٹکڑے کے چلے جانے کا انہیں قلق رہا۔ راستے میں انہوں نے روپ
کو گالیاں دیں اور جب اس کے منہ سے بھی کچھ نکل گیا تو انہوں نے اسے بے
طرح پیٹا تھا۔ جب وہ گھر آیا تو خون میں لت پت تھا —— روپ کے دل کا بگولا
آندھی بن چلا —— اس وقت اس کی دوکان کے لڑکے آوازیں لگا رہے تھے۔
”اکنی کا کھلونا دو پیسے میں“ تب ہری چلایا ”اکنی کا کھلونا ڈیڑھ پیسے میں“ روپ
اٹھ کر چیخا۔ ”اکنی کا کھلونا ایک پیسے میں۔“

”تمہیں تمہارے باپ کی قسم بیٹھے رہو۔“ کملا نے منت کے لہجے میں کہا۔ اور
اسے ہاتھ کھینچ کر بٹھا دیا۔ روپ کی نظر کملا پر گئی —— جونہی ایک کھلونا بکتا
وہ بجلی کی سی تیزی سے دوسرا انہیں دے دیتی۔ اگر کملا نہ ہوتی تو وہ کبھی میلے میں
آنے کے قابل نہ ہوتا —— ساری ساری رات وہ اسے گرم اینٹ کا سینک دیتی
رہی تھی۔ پھر اس کی تیمار داری کرنے کے ساتھ نہ صرف وہ اس کے لئے دوا
لاتی اور کھانا پکاتی، بلکہ وہی کھلونے بناتی پکاتی اور رنگتی رہی تھی۔ اس میں کچھ
الیسا گن تھا کہ محلے بھر کے چھوٹے چھوٹے بچے ان کے احاطے میں جمع ہو جاتے
اور ہنسی خوشی ان کا ہاتھ بٹاتے۔ کوئی بنے ہوئے کھلونوں کو اٹھا اٹھا کر
دھوپ میں رکھتا۔ کوئی سوکھے ہوئے کھلونوں کو پکانے کے لئے جمع کرتا، کوئی

پکے ہوئے کھلونوں کو کھڑیا مٹی سے رنگتا اور بیسیوں چھوٹے چھوٹے کام پلک جھپکتے ہو جاتے۔ بیماری کے ان چھ سات دنوں میں روپ کو اپنی تکلیف ذرا بھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ اس وقت جب دوسرے بھائیوں کی بیویاں رنگ برنگی دھوتیں پہنے مسی سے ہونٹ رنگے، سرسوں کا تیل سر میں ڈالے آنکھوں میں کاجل اور ماتھے پر بندی لگائے میلہ دیکھ رہی تھیں، کملا وہی مٹ میلی دھوتی پہنے اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی ـــــ اور اس کے میکے میں کسی نے مٹی کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا ـــــ تبھی روپ نے دیکھا کہ ہری اس کی دکان کے سامنے کھڑے گاہکوں کو آوازیں دے رہا ہے ـــــ وہ پھر غصے سے اٹھا۔ اس کے دل کی آندھی طوفان بن چلی ـــــ اس وقت ہری نے اس کے ایک گاہک کو کندھے سے کھینچا۔ روپ نے للکار دی۔ ہری نے جواب میں گالی دی۔ روپ کا غصہ اس کی آنکھوں میں سرخی بن گیا اس نے لاٹھی اٹھالی اور دوکان کے نیچے آگیا۔

بوڑھا بھیڑ سے بچتا بچاتا ہانپتا کانپتا چلا آرہا تھا ـــــ یہ اتنے بے شمار لوگ ـــــ یہ سب کھلونے ہی تو ہیں۔ لیکن یہ سب اپنے بنانے والے کو بھولے ہوتے ہیں ـــــ بالکل اسی طرح جیسے اس کے کھلونے اس کو بھول گئے تھے لیکن شاید وہ جہان کھلونے بنانے والا بھی اس کی طرح بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس نے ایک لمبی سانس لی ـــــ یہ اتنا راستہ جو وہ کبھی کھلونوں کا سب سے بڑا ٹوکرا اٹھائے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں طے کر لیتا تھا، اب بڑی مشکل سے تین چار گھنٹے میں طے کر پایا تھا ـــــ ہزاروں لوگ سوڈل کی پوجا کر کے اپنے اپنے کاموں پر جا لگے تھے۔ وہ شاید واپس ہو جاتا، شاید تھک کر راستے میں بیٹھا رہتا۔ لیکن ایک

نامعلوم سی تحریک اسے برابر دھکیل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک زبردست طوفان اٹھ رہا تھا۔ اور اسے لوگوں کی بھیڑ خونچے فروش سبیلیں اور دوکانیں کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اور اسے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے یہ طوفان اس کے گھونسلے کا تنکا تنکا بکھیر کر رکھ دے گا۔ وہ اس طوفان کے سامنے سینہ سپر ہو کر ڈٹ جانا چاہتا تھا۔ بڑی مشکل سے والنٹیئر کی منت کر کے وہ دکانوں کے عقب سے داخل ہوا لیکن جب وہ دکانوں کے پاس پہنچا تو طوفان اس کے نشیمن کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ لاٹھیوں کے حملوں سے کھلونوں کی دوکانیں بکھر چکی تھیں اور بھائی بھائی ایک دوسرے پر ٹوٹ چکے تھے ——— بوڑھے کا لوزہ ایک دم بند ہو گیا۔ اس کی کمر نہ جانے کیسے سیدھی ہو گئی۔ اس کی تکان نہ جانے کہاں اڑ گئی۔ لمحہ بھر کے لئے اسے معلوم ہوا جیسے وہ خود ہی پرانا کھلونے والا ہے اور وہ اس کے بنائے ہوئے کھلونے ہیں، جو گڈ مڈ ہو رہے ہیں اور اسے ان کو پھر اپنی اپنی جگہ رکھ دینا ہے اور وہ لٹھیا اٹھائے ہوئے اس طوفان میں گھس پڑا۔

میلہ ختم ہو گیا تھا۔ روپ ہری اور سندری میلے کے خیراتی ہسپتال میں پٹیاں باندھے پڑے تھے ——— چارپائیاں لکڑی کے تختے اور ٹین کے خالی کنستر جن سے یہ دوکانیں کھڑی کی گئی تھیں اور وہ کھلونے جو ان دکانوں میں سجائے گئے تھے سب بکھرے پڑے تھے اور ان سب کے درمیان ایک اوندھی چارپائی پر بوڑھا کھلونے والا پڑا تھا ——— سنسار کے اس انسانی فن کار کی طرح بے بس

جس نے کھلونے بنا کر اختیار کھو دیا ہے اور خود ایک کھلونا بن گیا ہے۔ — بے حس اور بے جان — لٹھیا اب بھی اس کے ہاتھ میں اٹھی ہوئی تھی۔ گویا وہ اب بھی اس طوفان کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ نامعلوم سی تحریک یہاں آکر ختم ہو گئی تھی۔ وہ بے جان پڑا تھا اور اس کے چہرے پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

نثری ادب

ناول

آخرِ شب کے ہم سفر	قرۃ العین حیدر	۲۵/-
کالے کوس	بلونت سنگھ	۶/-
ایک چادر میلی سی (انعام یافتہ کتاب)	راجندر سنگھ بیدی	۵/-
اداس نسلیں (انعام یافتہ کتاب)	عبد اللہ حسین	۱۵/-
امراؤ جان ادا	مرزا رسوا (تصویریں: حنیف رامے)	۶/-
باغ و بہار	میر امن (تصویریں: حنیف رامے)	۶/-
معصومہ	عصمت چغتائی	۶/-
سودائی	عصمت چغتائی	۵/-
غدار	کرشن چندر	۳/-
دھوپ اور شگوفے	اے حمید	۵/-
کپتان کا گدا	ڈی۔ ایچ۔ لارنس	۳/-
دو ملک ایک کہانی (رپورتاژ)	ابراہیم جلیس	۳/-

طنز و مزاح

سرِ راہے (انعام یافتہ کتاب)	مسعود مفتی	۶/-

ڈرامے

آؤ (مزاحیہ ڈرامے)	سعادت حسن منٹو	۱/۷۵
منٹو کے ڈرامے	سعادت حسن منٹو	۶/-
شیطان (مزاحیہ ڈرامے)	عصمت چغتائی	۴/-
شکنتلا	کالی داس	[illegible]
انسان کی زندگی	انڈریف	[illegible]

تنقید

تنقیدی مضامین	محمد حسن عسکری	[illegible]
معیار (انعام یافتہ کتاب)	ممتاز شیریں	[illegible]

خطوط

زیرِ لب	صفیہ اختر	۷/۵۰
حرفِ آشنا	صفیہ اختر	۷/۵۰
مکتوباتِ اکبر	اکبر الہ آبادی	۱/۵۰